دو مقامات کا سفرنامہ

حکایتِ مہر و وفا

○ حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری

○ دارالعلوم دیوبند کا نیازمندانہ سفر

تالیف

مفتی عبدالرؤف غزنوی

فاضل و سابق اُستاذ و خطیب دارالعلوم دیوبند (انڈیا)

اُستاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ غزنوی کراچی

0317-7034000 0333-2114000

دو مقامات کا سفرنامہ

- حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری
- دار العلوم دیوبند کا نیاز مندانہ سفر

تالیف

مفتی عبد الرؤف غزنوی

فاضل و سابق اُستاذ و خطیب دار العلوم دیوبند (انڈیا)

استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

نام کتاب	۔۔۔۔۔۔۔	حکایتِ مہر و وفا
مؤلف	۔۔۔۔۔۔۔	مفتی عبدالرؤف غزنوی
اشاعت اوّل	۔۔۔۔۔۔۔	2017ء-۱۴۳۸ھ
ناشر	۔۔۔۔۔۔۔	مکتبہ غزنوی، سلام کتب مارکیٹ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
فون	۔۔۔۔۔۔۔	0333-2114000 0317-7034000
قانونی مُشیر	۔۔۔۔۔۔۔	خواجہ سیف الاسلام ایڈوکیٹ ہائی کورٹ سندھ

ملنے کے دیگر پتے

اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ حبیبیہ، ہواڑی بازار، بونیر

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

وحیدی کتب خانہ، پشاور

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ، لاہور

مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی

خواہی کہ روشنت شود احوالِ سرِّ عشق
از شمع پرس قصّہ زبادِ صبا مپرس

ما قصّۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(حافظ شیرازیؒ)

پیشِ لفظ

الحمد للہ وحدہ ، والصّلٰوۃ والسّلام علیٰ من لانبي بعدہ ، وبَعدُ:

سفر کرنا ایک بامشقت کام ہے، اس لئے کہ ہر ذی شعور انسان اپنے مزاج اور اپنے دستیاب وسائل کے مطابق زندگی گزارنے کا ایک طریقۂ کار وضع کر لیتا ہے، جس میں وہ اپنی دینی ضروریات، دنیوی ضروریات، بال بچوں اور رشتہ داروں کے حقوق اور اپنے مشاغل و دلچسپی کے امور کو مدّنظر رکھ کر ایک نظام الاوقات بناتا ہے اور اسی نظام کے مطابق چلنے میں وہ سہولت واطمینان محسوس کر لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا بنایا ہوا نظام الاوقات اس کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ نظام الاوقات بنانا اور اسی کے مطابق روز وشب گزارنا اس وقت ممکن ہوتا ہے کہ انسان ایک ہی ماحول میں مقیم اور اپنے مزاج کے مطابق اپنی ضرویات کو ترتیب دینے کا اختیار رکھتا ہو۔ سفر کے اندر نہ تو اپنے تمام متعلقہ امور کو انسان اپنے منشے کے مطابق چلا سکتا ہے اور نہ ہی اپنی ضروریات کو اپنے مزاج کے مطابق ترتیب دینے کی سہولت اُسے حاصل ہوتی ہے۔

ناآشنا ماحول اور ناواقف لوگوں کے درمیان سفر کرنے والے مسافر کو جو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے تو ہر شخص واقف ہے !ایک معزز

مہمان کی حیثیت سے بلایا گیا مسافر جس کی سہولت کی خاطر میزبانوں نے اپنے حساب سے ہر ممکن انتظام کرلیا ہو وہ بھی اُن تمام انتظامات کے باوجود سفر میں مشقّت محسوس کرتا ہے، مثال کے طور پر میزبانوں نے اس کے آرام کے لئے اے۔سی والے کمرے اوراس کے اندر ایک قیمتی چارپائی پر بچھے ہوئے موٹے گدّے کا انتظام کیا ہو! لیکن مسافر کو اپنے مزاج کے مطابق اے۔سی سے زیادہ پنکھا اور پنکھے سے زیادہ قدرتی ہوا پسند ہو! اوراسی طرح اُسے چارپائی پر بچھے ہوئے موٹے گدّے سے زمین پر بچھی ہوئی چٹائی یا معمولی ہلکے گدّے میں زیادہ راحت محسوس ہوتی ہو، لیکن کمرے میں نہ پنکھا ہو، نہ قدرتی ہوا کا صحیح نظام اور نہ ہی زمین پر سونے کی سہولت! اسی طرح مسافر کو سادے کھانے کی عادت بن چکی ہو لیکن میزبانوں نے اکرام کے طور پر اس کے لئے پُرتکلّف مرغّن کھانوں کا انتظام کیا ہو، جن کے درمیان مسافر کے مزاج کے مطابق کوئی ایک سادی چیز بھی موجود نہ ہو! مذکورہ صورتِ حال کے اندر تمام انتظامات کے باوجود بھی مسافر کو مشقّت سے گزرنا پڑتا ہے، جس کا اظہار کرنا میزبانوں کے سامنے تو وہ مناسب نہیں سمجھتا، بلکہ ان کی دلجوئی کے لئے شکریہ کے الفاظ ادا کرتا ہے، البتہ دل دل میں مشقّت ضرور محسوس کرتا ہے۔

سفر کی گوناگوں مشقّتوں کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے نماز کے اندر قصر کرنے کا حکم اور رمضان المبارک کے روزوں کو مؤخّر کرنے کی اجازت دی ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سفر کی مشقتوں کا ذکر فرماتے ہوئے مسافر کو اپنی حاجت پوری کرنے کے بعد جلد از جلد اپنے وطن واپس لوٹنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ

فرماتے ہیں:

''السفر قطعة من العذاب يمنع أحدَكم طعامَه وشرابَه ونومَه فاذا قضٰى نهمته فليعجّل إلىٰ أهله''

(رواه البخاری ۱/۲۴۲)

یعنی ''سفر عذاب کا ایک حصہ ہے، وہ تمہیں کھانے، پینے اور سونے سے روکتا ہے، لہٰذا جب کوئی اپنی حاجت پوری کرلے تو اپنے گھر والوں کے پاس واپسی میں جلدی کرے''۔

احقر بچپن ہی سے کچھ تو اپنی فطرت و مزاج کی بنیاد پر اور زیادہ اپنے والدین اور پھر اپنے مشفق اساتذہ کرام کی تربیت کی برکت سے ایک منظم طرزِ زندگی اختیار کرنے اور نظام الاوقات کے تحت چلنے کا عادی رہا ہے، اسی وجہ سے سفر سے طبعی طور پر کبھی مانوس نہیں رہا، تاہم کچھ اسفار مسلمان کی زندگی میں ضروری اور اہم بھی ہوتے ہیں، جیسے صاحبِ استطاعت مسلمان کے حق میں حجِ بیت اللہ کا سفر، یا طالب علم کے حق میں طلبِ علم کے لئے سفر اور اسی طرح بعض دیگر اہم اسفار! چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ''وللّٰهِ على النّاس حجّ البيت من استطاع إليه سبيلاً'' فرما کر صاحبِ استطاعت عاقل بالغ مسلمان کے ذمہ زندگی میں ایک مرتبہ بیت اللہ کے سفر کو فرض کردیا، اور طلبِ علم کے لئے سفر کی اہمیت کو واضح فرماتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے استفادہ کرنے کی نیت سے سفر کرنے کا قصہ سورۂ کہف میں بیان فرمایا، اسی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری میں ''کتاب العلم'' کے اندر ''باب الخروج فی طلب العلم'' کا عنوان قائم کرکے اس کے تحت جہاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علمی سفر سے متعلق روایت ذکر کی ہے وہاں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے اس تاریخی واقعہ کا تذکرہ بھی کیا ہے، جس کے مطابق انہوں نے حضرت عبداللہ بن اُنیسؓ سے صرف ایک ہی حدیثِ نبوی براہ راست سننے کے لئے مدینہ منورہ سے سرزمین شام تک پورے ایک مہینے کا سفر کیا تھا۔

ایسی ضرورتوں کے تحت احقر نے بھی اپنی زندگی میں چند محدود اسفار کئے ہیں، جن میں سرِ فہرست اور زیادہ اہم دو سفر ہیں، نمبر ایک: حجاز مقدس کی والہانہ حاضری، نمبر دو: دارالعلوم دیوبند کا نیاز مندانہ سفر۔

مذکورہ دونوں اسفار کے دوران اپنے تاثرات ومشاہدات اور یادداشتوں کو میں نے اپنی ڈائریوں میں اس مقصد کے تحت بڑے شوق وذوق کے ساتھ قلمبند کردیا تھا کہ مستقبل میں اگر زندگی باقی رہی تو وقتاً فوقتاً اپنی روح کی تازگی اور اپنے قلبی جذبات کی تسکین کے لئے ان تاثرات ومشاہدات کو پڑھ کر اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرتا رہوں گا، اور ان میں جو مفید معلومات ہوں گی انہیں زبانی طور پر اپنے دوست واحباب اور عزیز طلبہ تک پہنچانے کی کوشش بھی کرتا رہوں گا، اپنے تاثرات کو ترتیب دے کر شائع کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

تاہم بعض مخلص دوستوں کے اصرار پر سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے نیاز مندانہ سفر کی روداد کو ترتیب دے کر ماہنامہ ''بیّنات'' کراچی سے چار قسطوں میں شائع کرانے کا ارادہ کیا، چنانچہ اس کی پہلی قسط جب شمارہ ماہِ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ مطابق ماہِ جون ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی تو قارئین نے اسے بہت ہی شوق سے پڑھا اور احقر کی ہمت افزائی کے لئے بعض اہل علم حضرات نے خطوط لکھے اور بعضوں نے فون کیا اور مزید ہمت افزائی اس سے ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کا

ترجمان ''ماہنامہ دارالعلوم'' نے بھی اسے دو قسطوں میں ماہِ ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۵ء کے شماروں میں شائع کیا، پھر ''ماہنامہ بیداری'' حیدرآباد نے بھی تین قسطوں میں ماہِ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۵ء کے شماروں میں شائع کیا۔

دارالعلوم دیوبند کے سفرنامہ کی مقبولیت اور قارئین کی مخلصانہ دعاؤں کی برکت سے میرے اندر یہ ہمت پیدا ہوئی کہ حجاز مقدس کی والہانہ حاضری کی یادداشتوں کو بھی ترتیب دوں اور اسے بھی سفرنامے کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کردوں، چنانچہ ترتیب دینے کے بعد ماہنامہ ''بیّنات'' کراچی سے اس کی اشاعت کا سلسلہ بھی قسط وار شروع ہوگیا اور چھ قسطوں کے اندر ماہِ ربیع الاول تا ماہِ شعبان ۱۴۳۸ھ کے چھ شماروں میں شائع ہوگیا۔ اس دوران کئی اہل علم و مخلص حضرات اور دوست واحباب نے ہمت افزائی فرماتے ہوئے کتابی شکل میں ان سفرناموں کو شائع کرنے کا صرف مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ اصرار بھی فرمایا، ان کی اس ہمت افزائی کو اپنے لئے سعادت سمجھتے ہوئے احقر نے مذکورہ دونوں مقامات کے سفرنامے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا، اور دونوں کی رودادِ سفر کی ترتیب میں تاریخ کے بجائے عظمت کو مدّنظر رکھا گیا، لہٰذا حجاز مقدّس کے تقدس کی بنیاد پر اس کی روداد کو مقدم رکھا گیا، اور پھر عالمِ اسلام کے ایک منفرد و بے مثال دینی و علمی مرکز دارالعلوم دیوبند کے سفر کا تذکرہ کیا گیا۔

مجھ جیسے گوشہ نشین و عزلت پسند طالبِ علم کو مذکورہ اسفار پر روانگی کے لئے حرمین شریفین کی والہانہ محبت و عقیدت اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابرین سے نیازمندانہ وابستگی و تعلق نے صرف آمادہ ہی نہیں بلکہ بے تاب کردیا تھا، اور میں حافظ شیرازیؒ کے مندرجہ ذیل شعر کا مصداق بن گیا تھا۔

من کز وطن سفر نگزیدم بعمر خویش
در عشقِ دیدنِ تو ہوا خواہ غربتم

مذکورہ دونوں اسفار کے علاوہ میری زندگی میں میرے چند اہم دیگر اسفار بھی ہو چکے ہیں، جن میں سے تین مختلف اسفار تو ایسے تھے جن میں احقر کو شاہی مہمان کی حیثیت حاصل رہی تھی اور تین الگ الگ بادشاہوں سے ملاقات بھی ہو گئی تھی، اُن اسفار کی یادداشتیں بھی اہم اور مفید معلومات پر مشتمل اور احقر کے پاس محفوظ ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ جن والہانہ جذبات کے تحت اِس سفرنامے کے اسفار انجام پذیر ہو چکے ہیں دیگر اسفار کے جذبات ان کے ہم پلّہ نہیں ہو سکتے! اس لئے اُن دیگر اسفار کی یادداشتوں کو سرِ دست نہ تو ترتیب دی گئی اور نہ ہی اِس سفرنامے میں ان کی روداد کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی، بلکہ حافظ شیرازیؒ کے مندرجہ ذیل شعر کے مطابق دنیوی شان وشوکت والے بادشاہوں اور طاقتور لوگوں کی افسانہ گوئی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے محبّت ووفاداری کی داستان بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا اور نام بھی ''حکایتِ مہر ووفا'' تجویز کیا گیا ؎

ما قصّہٗ سکندر و دارانخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر ووفا مپرس

مجھے پوری امید ہے کہ اس کتاب کے اندر قارئینِ کرام کو مفید معلومات ملنے کے ساتھ ساتھ ان کے دینی جذبات اور ایمانی ولولوں کو جوش وخروش کا سامان بھی مہیّا ہو گا، اور وہ اس فقیر کو اپنی غائبانہ دعاؤں میں یاد فرمائیں گے۔

عبدالرؤف غزنوی عفا اللہ عنہ

۱۴۳۸/۱۰/۲۹ھ

۲۰۱۷/۷/۲۴ء

حجازِ مُقدّسہ کی والہانہ حاضری

مورِ مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسَد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

(سَعدی شیرازیؒ)

حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری

ایک مسلمان بچہ اپنے بچپن کے اندر جیسے ہی کچھ ہوش سنبھالنے اور بات سمجھنے لگتا ہے تو اپنے والدین اور بڑوں سے کعبۃ اللہ اور روضۂ رسول مقبول (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا تذکرہ سنتا رہتا ہے، اور جب وہ تقریباً سات سال کی عمر میں نماز پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور اس کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ نماز کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ نمازی کا رُخ کعبۃ اللہ کی طرف ہو تو اس کے دل میں کعبۃ اللہ کی عظمت اور اس کی طرف ایک غیر اختیاری کشش پیدا ہو جاتی ہے، اور جب اس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا آخری نبی مان لیا جائے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اسلام کے بنیادی احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عاقل بالغ صاحبِ استطاعت مسلمان کے ذمہ زندگی میں ایک مرتبہ حج بیت اللہ فرض ہے تو اس کا دل حجازِ مقدس کی حاضری کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے، اور آگے چل کر جب اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا کچھ حصہ اور اس کے ضمن میں مدینہ منورہ کا تعارف اور روضۂ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تقدس وعظمت بتائی جاتی ہے تو اس کی بے تابی ایک تڑپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

راقم الحروف کے بچپن اور طالب علمی کا زمانہ حرمین شریفین کی محبت اور وہاں پر حاضری کی تمنا کے حوالہ سے مذکورہ بالا کیفیت کے ساتھ گزر گیا، اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے حاضری کا موقع نہ مل سکا، درسِ نظامی سے فراغت کے بعد ہی

اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ-۱۴۰۳ھ کو تدریس کی خدمت پر مامور ہوا، جب کہ مسجد دارالعلوم کی امامت وخطابت کی ذمہ داری دورۂ حدیث پڑھنے کے سال سے احقر کے سپرد ہو چکی تھی، تدریس و امامت دونوں کے عوض دارالعلوم دیوبند سے مجھے چھ سو نوے روپے مشاہرہ ملتا تھا، جس میں ظاہری قلت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت رکھی تھی، تاہم اس معمولی مشاہرہ سے اتنا بچانا جو حج کے اخراجات کے لیے کافی ہو جاتا' ناممکن تھا، لہٰذا! دل ہی دل میں حرمین شریفین کی حاضری کی تمنا جمی رہتی تھی، اور اس تمنا کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دعا کے علاوہ کوئی اور ظاہری سبب نظر نہیں آ رہا تھا:

اے غائب از نظر کہ شدے ہمنشینِ دل
میگویمت ثنا و دعا مے فرستمت

ایک عارف باللہ صاحبِ حال بزرگ کی دعا کا اثر

دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے زمانہ میں جناب قاری عبدالحفیظ صاحب زید مجدہم - استاذ شعبۂ تجوید دارالعلوم دیوبند - کی معیت میں ان ہی کی موٹر سائیکل پر ایک دفعہ بروز اتوار ۱۷/ ۱۲/ ۱۴۰۶ھ کو شیخ علاء الدین علی بن احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۳ ربیع الاول ۶۹۰ھ) خلیفۂ اجل حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۵ محرم ۶۶۴ھ) کے مزار پر حاضری دینے کے لیے کلیر شریف جو دیوبند سے تقریباً پچاس کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، جانے کا پروگرام بنا، قاری صاحب چونکہ دیوبند کے مضافات اور ان کے راستوں سے خوب واقف تھے، اس لیے یہ راستہ مختصر وقت میں طے ہوا۔

آستانۂ صابری پر حاضری دینے سے سکون واطمینان کے بجائے وہاں پر موجود بدعت کے ماحول کو دیکھ کر کدورت لاحق ہوگئی۔ فاتحہ خوانی وایصالِ ثواب کے لیے بھی مزار کے بجائے قریب میں واقع مسجد کو منتخب کرنا پڑا، کیونکہ مزار کے پاس موجود بدعات کو روکنا ہمارے بس میں نہ تھا، البتہ وہاں سے الگ ہونا ہمارے بس میں تھا، اس لیے جلد از جلد وہاں سے الگ ہونے کو ترجیح دی، اور میں نے رفیق سفر اور اپنے کرم فرما جناب قاری صاحب موصوف سے یہ بات بھی عرض کردی کہ اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ یہاں ایسا ماحول ہے تو حاضری کی کوشش نہ کی جاتی۔ مسجد میں فاتحہ خوانی اور ایصالِ ثواب کر کے ہم نے واپسی کا پروگرام بنایا، جناب قاری صاحب نے واپسی میں بتایا کہ راستہ میں ایک گاؤں ''نانکہ'' آتا ہے، جہاں حضرت حافظ عبدالستار صاحب دامت برکاتہم رہتے ہیں، جو کہ تارک الدنیا، صاحبِ حال، مستجاب الدعوۃ اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ (متوفّٰی ۱۴؍ربیع الاول ۱۳۸۲ھ) کے خلیفہ ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں تو ان کی خدمت میں بھی حاضری دیتے ہیں۔ میں نے کہا: یہ تو میری بڑی سعادت ہوگی، اور اس حاضری سے اس کدورت کی بھی بڑی حد تک تلافی ہو جائے گی، جو آستانۂ صابری پر حاضری کے وقت وہاں پر موجود بدعات کے ماحول کو دیکھ کر لاحق ہوگئی ہے۔

بہر صورت حضرت حافظ عبدالستار صاحب سے ملاقات کے لیے اُن کے گاؤں ''نانکہ'' پہنچے، اور اُن کے مکان پر (جو ایک سادہ سا مکان تھا) حاضری دی، اس سے قبل کہ ہم کسی سے یہ معلوم کر لیتے کہ حافظ صاحب تشریف فرما ہیں یا نہیں؟

ملاقات ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس مکان سے سادہ لباس میں ملبوس ایک شخص باہر تشریف لائے اور مکان سے ذرا فاصلہ پر واقع مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔ میرا تو یہ خیال ہوا کہ حافظ صاحب کے خدام یا متعلقین میں سے یہ کوئی صاحب ہوں گے، لیکن قاری عبدالحفیظ صاحب چونکہ پہلے ہی سے ان سے واقف تھے، فرمانے لگے: یہی حضرت حافظ عبدالستار صاحب زید مجدہم ہیں۔ سلام ومصافحہ تو اسی وقت ہم نے آگے بڑھ کر ان سے کرلیا، لیکن انہوں نے سلام کے جواب ومصافحہ کے علاوہ ہم سے اور نہ ہی وہاں پر موجود کسی اور شخص سے کوئی خاص بات کی، اور مسجد کی طرف چلے گئے، ہم بھی پیچھے پیچھے مسجد تک گئے، مسجد پہنچ کر حضرت حافظ صاحب مسجد کے ایک حصہ میں بچھی ہوئی ریت پر پشت کے بل لیٹ گئے، اور کسی سے کوئی بات نہیں کی، اور چونکہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا، اس لیے ہم بھی ان کے قریب بیٹھ گئے، ان کی سادگی اور اونچی نسبت کو دیکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث پاک یاد آنا ایک قدرتی بات تھی جو آپ ﷺ نے حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر ارشاد فرمائی تھی کہ:

”كم من أشعثَ أغبرَ ذي طَمرين لايُؤْبَهُ له لوأقسم على الله لأبرّه منهم البراء بن مالك(رواه الترمذی بسنده عن أنس بن مالك رضی الله عنه)“

یعنی ”بہت سے پراگندہ بال، غبار آلود جسم، دو پرانے کپڑے پہننے والے جن کو عام طور پر کوئی اہمیت نہ دی جاتی ہو، (اللہ کے یہاں ان کا اتنا اونچا مقام ہوتا ہے کہ) اگر وہ کسی بات کی قسم بھی کھالیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ (ان کی بات کی لاج رکھتے ہوئے) ان کی قسم کو پوری کردیتا ہے، جن میں سے ایک براء بن مالک رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔“

قاری عبدالحفیظ صاحب نے حضرت حافظ صاحبؒ سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میرے ساتھ آنے والے یہ شخص دارالعلوم دیوبند کے نوجوان اساتذہ میں سے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی مسجد کے امام بھی ہیں، آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، حافظ صاحب ایک دم اُٹھ گئے، میں نے ان سے ادب کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے مزاج پرسی کی، انہوں نے بھی خیریت پوچھی، میں نے ان سے تین دعاؤں کی درخواست کی، جن میں سے ایک دعا حج بیت اللہ نصیب ہونے سے متعلق تھی، انہوں نے فوراً دونوں ہاتھ اُٹھا کر ذرا لمبی سی خفیہ دعا کی، دعا کے بعد ہم نے اُن سے رخصت لی، اور واپس دیوبند آگئے۔

اس خدا رسیدہ بزرگ حضرت حافظ عبدالستار صاحب رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی دعا کا اثر راقم نے اس طرح دیکھا کہ ۱۷/ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ کو مذکورہ دعا ہوئی تھی۔ ۲۱/ذوالقعدۃ ۱۴۰۷ھ کو غیر متوقع طور پر جامعۃ الملک سعود ریاض میں احقر کے داخلہ کی اطلاع موصول ہوئی۔ یکم صفر ۱۴۰۸ھ کو ریاض پہنچا، ۱۹/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب حرمِ مکی کی پہلی زیارت اور عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی اور شبِ جمعہ ۲۰/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو مسجد نبوی اور روضۂ اقدس (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی پہلی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، اور ماہِ ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ ہی کو پہلے حج کی سعادت میسر ہوئی۔ مذکورہ اجمال کی تفصیل درج کرنے سے پہلے حضرت حافظ عبدالستار صاحب قدس سرہٗ کا مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عارف باللہ حضرت حافظ عبدالستار صاحب کا مختصر تذکرہ

حضرت حافظ عبدالستار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴/شعبان ۱۳۲۷ھ مطابق ۲/ستمبر ۱۹۰۹ء موضع ''ہرچند پور''، تحصیل ''روڑکی''، ضلع ''سہارن پور'' میں ایک

ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں، جہاں تعلیم وتربیت سے کوئی آشنا نہ تھا، اس لیے ان کا نام بھی اسی ماحول کے مطابق شبِ براءت سے منسوب کرتے ہوئے ''شبراتی'' رکھا گیا۔ بچپن میں ان کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا تو پرورش کی ذمہ داری دادا محترم نے اپنے کندھوں پر لی۔ کچھ عرصہ بعد دادا جان کا بھی انتقال ہوگیا تو ان کی پرورش کی ذمہ داری نانا محترم پر آگئی۔ نانا جان نے ان کو کچھ ابتدائی دینی تعلیم اور پھر کچھ ابتدائی عصری تعلیم دلادی، پھر انہوں نے بدرجۂ مجبوری تعلیم کا سلسلہ موقوف کرکے گھر کا کام اور والدہ محترمہ کی خدمت شروع کردی، اس کے بعد دل میں حفظِ قرآن کا ولولہ پیدا ہوا اور اپنی والدہ محترمہ سے اس کا تذکرہ کردیا۔ والدہ نے اجازت دی، تو انہوں نے حفظ قرآن کے ارادہ سے رائے پور کا سفر شروع کیا، لیکن راستہ میں ایک قصبہ ''بہٹ'' پڑتا ہے، جو رائے پور سے تقریباً آٹھ کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، یہاں انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور معلوم ہوا کہ یہاں پر بھی حفظ قرآن کرایا جاتا ہے، تو انہوں نے رائے پور کا ارادہ ملتوی کردیا، اور ''بہٹ'' میں حفظ قرآن شروع کیا' جہاں کھانے کا کوئی نظم نہیں تھا، البتہ ایک طالب علم نے جس کا کھانا کسی کے گھر سے آتا تھا، بہ خوشی اپنے کھانے میں ان کو شریک کیا، اور اس طرح انہوں نے حفظ قرآن مکمل کرلیا۔

حفظ قرآن کے بعد مزید تعلیم کے لیے مدرسہ رکنیہ جو ''سکروڈہ'' نامی بستی میں واقع تھا' داخل ہوئے، جہاں انہوں نے فارسی کی کئی کتابیں مولانا خدابخش صاحب سے پڑھیں، آپ کی تواضع وخاکساری اور اساتذہ کی خدمت واحترام کی وجہ سے منتظمین واساتذہ بالخصوص مولانا خدابخش صاحب آپ پر بے حد شفقت

وعنایت فرماتے، اور مولانا موصوف ہی آپ کو رائے پور حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی خدمتِ بابرکت میں لے جاتے رہے، یہاں تک کہ آپ کو حضرت رائے پوری قدس سرہٗ سے والہانہ محبت وعقیدت پیدا ہوگئی، اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے، حضرت رائے پوریؒ نے آپ کا نام تبدیل کر کے ''شبراتی'' کے بجائے ''عبدالستار'' تجویز فرمایا، اور آپ کی اصلاح پر خوب توجہ دی، یہاں تک کہ ماہِ فروری ۱۹۵۰ء کو انہیں اجازتِ بیعت مرحمت فرماتے ہوئے خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ ونسبت کا یہ کرشمہ ظاہر ہوا کہ ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولنے والے ''شبراتی'' جہاں تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ تھا، عارف باللہ حضرت حافظ عبدالستار صاحب نانکوی کے نام سے مرجع خاص وعام بن گئے۔ بڑے بڑے اہل علم ان کے معتقد ومداح ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں بھی ان کے جاننے والوں کے درمیان یہ مشہور ہوگیا کہ وہ صاحبِ حال اور مستجاب الدعوۃ بزرگ ہیں۔ ہمارے استاذ و مرشد فقیہ الامّت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صاحب قدس سرہٗ -صدر مفتی دارالعلوم دیوبند- اور دیگر اکابرین بھی ان سے کافی محبت فرماتے تھے۔ حضرت مولانا محمد سعیدی صاحب دامت برکاتہم -ناظم ومتولی مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارن پوران کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ ممتاز مستجاب الدعوات اور مرجع خلائق ہستی تھے، جہاں حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ سے انتساب نے ان کی عظمت کو چار

چاند لگائے ہیں، وہیں حضرت حافظ صاحب موصوف کی ذات گرامی کی نسبت سے ''نانکہ'' نامی بستی کی شہرت ونیک نامی کو قابل رشک عروج حاصل ہوا۔''

(تذکرہ حافظ عبدالستار نانکویؒ)

حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلوی صاحب ان سے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

''وہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری نوّر اللہ مرقدہٗ وبرّد اللہ مضجعہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے، مستجاب الدعوات تھے، سادگی، بے تکلفی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اپنے شیخ سے بے حد محبت اور عقیدت تھی، تا آنکہ شکل وشباہت میں حضرت رائے پوری کا عکس نظر آنے لگا تھا، اور شیخ ومرشد ہی کی نسبت سے رائے پور سے بے انتہاء تعلق تھا، رائے پور کی طرف پیر پھیلانا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔''

(تذکرہ حافظ عبدالستار نانکویؒ)

حضرت حافظ عبدالستار صاحبؒ اگرچہ اصطلاحی عالم نہیں تھے، لیکن علمائے ربّانیین بالخصوص ان کے شیخ حضرت اقدس مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت ونسبت کی برکت سے عالم گر ہو گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے تعلیم وتربیت کے میدان میں ان سے بڑا کام لیا۔ انہوں نے اگست ۱۹۳۱ء کو نانکہ نامی گاؤں کی مسجد میں وہاں کے لوگوں کی درخواست پر امامت کا سلسلہ شروع فرمایا، اور پوری زندگی اسی مسجد میں امامت کے ساتھ ساتھ تعلیم وتربیت، اصلاح وتزکیۂ نفس کی قندیلیں روشن کرتے ہوئے گزار دی۔ ۱۹۳۳ء کو مسجد کی شرقی سمت میں ایک مکتب قائم کیا' جس کا نام ''مکتبِ اسلامی امدادی'' تجویز فرمایا۔ رفتہ رفتہ طلبہ کی تعداد بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ انہوں نے اس مکتب کو موضع ''گندیوڑہ'' کی سرحد میں منتقل کرایا، اور اپنے شیخ الشیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ (متوفّٰی ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ) سے منسوب فرماتے ہوئے اس

کا نام ''مدرسہ فیض الرحیم'' رکھ دیا، جہاں تعلیم وتربیت، مردم سازی وتزکیہ کا سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا، اور حضرت حافظ صاحبؒ کے وصال کے بعد ان کے متوسلین و متعلقین نے اس ادارہ کو ''جامعہ ستاریہ فیض الرحیم'' کا عنوان دیا، جس سے تادم تحریر لوگ استفادہ واستفاضہ کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تا روزِ قیامت اس سلسلہ کو جاری رکھیں۔

حضرت حافظ صاحبؒ کو حرمین شریفین سے عشق کی حد تک محبت تھی، اور یہ دعا بکثرت فرماتے تھے: ''یا اللہ! مجھے اپنے گھر بلالے اور وہیں موت نصیب فرمادے''، اللہ تعالیٰ نے ان کو پانچ مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت سے نوازا۔ آخری حج ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء کو ادا فرمایا، جہاں ان کی آخری تمنا پوری ہوگئی، اور حج سے فارغ ہوتے ہی بروز اتوار ۱۶/ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸/ جولائی ۱۹۹۰ء اذانِ ظہر کے وقت مکہ مکرمہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اسی دن بعد نمازِ عصر مدرسہ صولتیہ میں ان کی پہلی نمازِ جنازہ حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندہلوی دامت برکاتہم۔ صاحبزادہ محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندہلوی قدس سرہٗ۔ کی اقتدا میں ادا کی گئی، اور دوسری نمازِ جنازہ بعد نمازِ مغرب مسجد حرام میں امامِ حرم کی اقتداء میں ادا کی گئی، اور پھر جنت المعلّٰی میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔

کسی نے ان کے بارے میں خوب کہا ہے:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا
ستار پیر بھی صاحبِ نسبت فقیر تھا

اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

نوٹ:

حضرت حافظ عبدالستار صاحب نانکوی قدس سرہٗ کی زندگی سے متعلق مذکورہ بالا مضمون میں اپنی ذاتی معلومات کے ساتھ ساتھ ''تذکرہ حافظ عبدالستار نانکویؒ'' تالیف: مولانا محمد عابد ندوی زید مجدہم سے بھی کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب کافی تلاش کے بعد میرے ہم نام اور دورۂ حدیث کے محترم ساتھی برادرِ مکرم جناب مولانا قاری عبدالرؤف صاحب بلندشہری زید مجدہم استاذِ تجوید وقراءت دارالعلوم دیوبند نے ''نانکہ'' گاؤں سے منگوا کر کراچی بھجوادی۔ جزاہُ اللہُ خیر الجزاء.

جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ لینے کا داعیہ

حضرت حافظ عبدالستار صاحبؒ کی خدمت میں حاضری اوران سے دعا کی درخواست کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک مرتبہ جناب مولانا مجیب اللہ صاحب گونڈوی استاذ دارالعلوم دیوبند (حال استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) کے کمرہ میں جو دارِجدید کے مشرقی حصہ میں دوسری منزل پر واقع تھا، محض ایک ملاقات کے لیے فارغ وقت میں میری حاضری ہوئی، وہاں پر چند نوجوان اساتذۂ دارالعلوم کی مجلس جمی ہوئی تھی، اور جامعۃ الملک سعود ریاض سعودی عرب کے شعبۂ معهد اللغة العربية میں غیر عرب معلّمین ومدرّسین کے داخلہ سے متعلق گفتگو فرمارہے تھے۔ وہ حضرات کہہ رہے تھے کہ اس شعبہ میں غیر عرب معلّمین کو عربی زبان میں تدریس کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے، لہٰذا ہمیں بھی اس کورس میں داخلہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ داخلہ کی صورت میں عربی زبان میں استفادہ کے ساتھ ساتھ حرمین شریفین حاضری کا موقع بھی

میسر رہے، میں تو بالکل خالی الذہن اور نو وارد تھا، اور صرف ایک ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا، تاہم ان کی مذکورہ بالا گفتگو سن کر میرا جذبۂ محبت بھی بیدار ہوا، اور دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے بھی اس نعمت کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اُدھر اُن حضرات سے اپنے اس داعیہ کے اظہار کے لیے حیاء مانع بن رہی تھی، لیکن چونکہ وہ حضرات بے تکلف دوست تھے، اس لیے بالآخر میں نے ان سے یہ گزارش کر ہی لی کہ اگر اجازت ہو تو میں بھی داخلہ کی کوشش کروں، اور آپ حضرات سے راہنمائی حاصل کروں! اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، اُنہوں نے اجازت دینے کے ساتھ ساتھ طریقۂ کار اور کاغذات بھیجنے کا پتہ بھی بتا دیا۔

راقم نے عربی زبان میں ایک درخواست برائے داخلہ لکھ کر اپنی سندوں اور دارالعلوم کی طرف سے ایک سفارشی تحریر کے ساتھ بروز جمعہ ۲/ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ کو مذکورہ پتہ پر ارسال کر دی۔ ظاہری اسباب کے اعتبار سے داخلہ کی امید اس وجہ سے کچھ کم تھی کہ داخلے محدود تھے، اور امیدوار لامحدود! صرف دارالعلوم دیوبند کی طرف سے بھی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، میرے علاوہ کئی دوسرے حضرات نے بھی درخواستیں بھیجی تھیں، اور ''ندوۃ العلماء'' اور دیگر اداروں سے متعلق حضرات بھی کافی دلچسپی لے رہے تھے، اور مؤثر سفارشات کے ساتھ درخواستیں بھیج رہے تھے۔

احقر کا ایک خواب اور جامعۃ الملک سعود کی طرف سے ہمت افزا اطلاع

۴/جمادی الثانیۃ ۱۴۰۷ھ کو منگل اور بدھ کی درمیانی شب احقر نے خواب دیکھا کہ ''کوئی شخص احقر کا سر مونڈ رہا ہے اور سامنے پانی کا ایک چشمہ بھی نظر آ رہا ہے'' آنکھ کھلنے کے بعد اس مختصر خواب کی تعبیر احقر کے ذہن میں یہ آئی کہ ان شاء اللہ! حجِ

بیت اللہ نصیب ہوگا، سر مونڈنا احرام کھولنے کی طرف اشارہ ہے، اور پانی کا چشمہ آبِ زمزم ہے۔ فجر کی نماز کے بعد اس خواب کا تذکرہ دارالعلوم دیوبند کے ایک بڑے استاذِ حدیث حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم سے کردیا تو انہوں نے مذکورہ بالا تعبیر کی تحسین فرمائی۔

اس خواب کے گیارہ دن بعد بروز ہفتہ ۱۴/ جمادی الثانیۃ ۱۴۰۷ھ کو جامعۃ الملک سعود کی طرف سے ایک جوابی تحریر موصول ہوئی، جس میں میری بھیجی ہوئی درخواست موصول ہونے اور اس پر غور کرنے کا تذکرہ تھا اور ساتھ ساتھ ایک فارم بھی بھیجا گیا تھا اور مجھے اس فارم کو پُر کرنے اور سعودی عرب کے سفارت خانے سے تصدیق شدہ اسناد کے ساتھ جلد از جلد بھیجنے کا حکم دیا گیا تھا۔ احقر نے حکم کے مطابق فارم کو پُر کر کے مطلوبہ کاغذات کے ساتھ بروز پیر ۲۳/ جمادی الثانیۃ ۱۴۰۷ھ کو بذریعۂ ڈاک ارسال کردیا۔

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم کا ایک خواب

۲۱/ جمادی الثانیۃ ۱۴۰۷ھ کو بروز ہفتہ دارالحدیث تحتانی دارالعلوم دیوبند میں جلسہ انعامیہ ہورہا تھا۔ حسب معمول اساتذۂ دارالعلوم بشمول استاذ حدیث حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم (حال شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ احقر بھی حضرت الاستاذ کے قریب ذرا پیچھے کی طرف بیٹھا ہوا تھا، اسی دوران حضرت الاستاذ مدظلہم نے مجھے اپنے قریب بلاکر آہستہ آواز میں بتایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ ''میں حج

پر گیا ہوں اور آپ (عبدالرؤف) بھی ساتھ ہیں۔" حضرت الاستاذ کے اس مبارک خواب کو "بشارتِ منامی" سمجھ کر حرمین شریفین حاضری کی امید میں اضافہ ہو گیا۔

حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کارآمد نصیحت

جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ ملنے اور اس بہانے حرمین شریفین حاضری کی امیدوں میں اضافہ ہو رہا تھا، لیکن اپنے محترم استاذ حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔(متوفیّٰ ۱۴۱۲ھ) کی ایک قیمتی نصیحت جس سے انہوں نے اس موقع پر احقر کو نوازا' برابر پیشِ نظر رہی، حضرتؒ نے فرمایا:

> "کسی مفید یا کم از کم جائز مقصد کے حصول کے لیے مناسب طریقہ سے کوشش کرنے اور جائز وسائل بروئے کار لانے میں تو کوئی حرج نہیں، البتہ یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اس کوشش کے بعد اگر وہ مقصد حاصل ہوا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے، اور اگر حاصل نہ ہوا تب بھی پریشانی کی ضرورت نہیں، بلکہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ضرور ہوگی کہ یہ مقصد بروقت حاصل نہ ہو سکا اور اسی میں میری بہتری ہوگی۔"

مذکورہ بالا نصیحت کی روشنی میں احقر ذہنی طور پر اس کے لیے بھی آمادہ تھا کہ اگر یہ داخلہ ہو گیا تو اس کو اللہ تعالیٰ کا ایک انعام سمجھوں گا اور اس کے لیے بھی تیار تھا کہ داخلہ نہ ہوا تو پریشان نہیں ہوں گا، بلکہ یہی سوچوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت اور میری بہتری اسی میں ہوگی۔حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی مذکورہ نصیحت کی

برکات آج تک محسوس کر رہا ہوں، اس لیے کہ اپنی محدود زندگی میں مختلف معاملات ومقاصد سے واسطہ پڑتا رہا اور بعض امور کو بہتر سمجھ کر اُن کے حصول کے لیے مناسب انداز سے کوششیں بھی کی گئیں، آگے کبھی تو ایسا ہوا کہ مقاصد حاصل ہوئے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بروقت حاصل نہیں ہوئے، لیکن اطمینان دونوں صورتوں میں قائم رہا، فللّٰہ الحمد و المنۃ۔

جامعۃ الملک سعود میں داخلہ کی اطلاع

۲۱/ ذوالقعدۃ ۱۴۰۷ھ بروز ہفتہ جامعۃ الملک سعود ریاض سے احقر کے نام دارالعلوم دیوبند کے پتہ پر ایک تحریر موصول ہوئی، جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کا داخلہ ''معہد اللغۃ العربیۃ'' میں منظور ہو چکا ہے۔ آپ ۱۴۰۸/۲/۲۳ھ سے کم از کم ایک ہفتہ قبل پاکستان جا کر سعودی سفارت خانہ سے رابطہ کریں، جہاں سے آپ کو تعلیمی ویزا اور ریاض جانے کا ٹکٹ دونوں مل جائیں گے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی کرم اور حضرت حافظ عبد الستار صاحب رحمہ اللہ کی دعا کا اثر تھا کہ دارالعلوم دیوبند سے احقر کے علاوہ اور بھی چند ہم عصر اساتذہ نے داخلہ کے لیے درخواستیں بھیجی تھیں، بلکہ احقر نے تو ان ہی کو دیکھ کر اور ان ہی سے راہنمائی حاصل کر کے درخواست بھیجی تھی، لیکن داخلہ صرف احقر کو نصیب ہوا۔

اس داخلہ کی اطلاع اپنے اساتذۂ کرام اور حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمہٗ اللہ- مہتمم دارالعلوم دیوبند- کو پہلی ہی فرصت میں کر دی، جنہوں نے خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے مبارک باد، دعاؤں اور گراں قدر نصیحتوں سے نوازا۔

اس کے بعد احقر نے پاکستان جانے کی تیاری کرلی، اور تدریس وامامت دونوں سے متعلق دارالعلوم دیوبند کو چھٹی کی درخواست پیش کردی، جو کہ خوشی کے ساتھ منظور ہوگئی، اور یکم محرم الحرام ۱۴۰۸ھ بروز جمعرات بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے کراچی پہنچا، اور کراچی سے بذریعہ بس کوئٹہ پہنچ کر عزیز واقارب سے ملاقات کرکے ان سے رخصت لی، پھر اسلام آباد جاکر سعودی سفارت خانہ سے تعلیمی ویزا اور کراچی تا ریاض ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کرکے ۲۹؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ کو بروز جمعرات اسلام آباد سے کراچی آگیا۔

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں قیام اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کی ایک قیمتی نصیحت

دارالعلوم دیوبند کے بعد احقر کو جامعہ علوم اسلامیہ علّامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ماحول اور اس کی عالی شان مسجد میں ایک غیر اختیاری خوشی اور سکونِ قلب محسوس ہوتا تھا، حالانکہ نہ تو اس ادارے میں مجھے پڑھنے کا موقع ملا تھا، اور نہ ہی بانیٔ جامعہ حضرت علّامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرّہٗ کی زیارت کی سعادت ملی تھی، ہاں! معارف السنن مطالعہ کرنے اور دارالعلوم دیوبند میں حضرت بنوری قدس سرّہٗ کا تذکرۂ خیر سننے کا موقع ضرور ملا تھا، اور اپنے اساتذۂ کرام سے یہ بھی سنا تھا کہ محدّث العصر حضرت علّامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرّہٗ کے شاگردوں میں سے سب سے فائق اور اُن کے علوم ومعارف کے امین حضرت بنوری قدس سرّہٗ تھے۔ اس بنیاد پر حضرت بنوریؒ اور ان کے ادارہ سے ایک قلبی

محبت ضرور تھی، لہٰذا میری کوشش ہوتی تھی کہ جب بھی دیوبند سے کراچی آنا ہوتا تو قیام جامعہ علوم اسلامیہ علّامہ بنوری ٹاؤن میں کرتا، چنانچہ اِس مرتبہ بھی اسلام آباد سے کراچی پہنچ کر ایک دن کے لیے جامعہ ہی میں قیام کیا۔

جامعہ علوم اسلامیہ علّامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں احقر کے قیام کے دوران دارالعلوم دیوبند کی نسبت کی وجہ سے حضرت مولانا سید رشید الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ -امام وخطیب جامع مسجد علامہ بنوری ٹاؤن- (متوفّٰی ۱۴۲۱ھ) وقتاً فوقتاً مغرب یا فجر کی نماز پڑھانے کے لیے مجھے حکم دے دیا کرتے، چنانچہ ۳۰؍محرم ۱۴۰۸ھ بروز جمعہ بھی فجر کی نماز پڑھانے کا مجھے حکم دے دیا گیا، نماز ودعا سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی قدس سرہٗ -فاضلِ دارالعلوم دیوبند واستاذِ حدیث وتفسیر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن- (متوفّٰی ۱۴۰۹ھ) جو پہلی صف میں مولوی سید یوسف حسن طاہر صاحب مؤذن مسجد (حال امام وخطیب مسجد) کے بغل میں تشریف فرما تھے، ان سے دریافت فرمانے لگے کہ یہ نماز پڑھانے والا کون ہے؟ انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی نسبت کا ذکر بھی کر دیا، میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر حضرتؒ سے مصافحہ کیا اور دارالعلوم دیوبند کی سفارش پر جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ ملنے اور آج ہی بعد نمازِ جمعہ ریاض روانہ ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے دعا کی درخواست کی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: ’’جاؤ! لیکن خیال رکھنا کہیں وہاں پر اغواء نہ ہوجاؤ۔‘‘ حضرت مولانا ادریس صاحب قدس سرہٗ کی یہ مخلصانہ، مختصر اور جامع نصیحت آگے چل کر احقر کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

کراچی سے ریاض روانگی

۳۰/محرم ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۵/ستمبر ۱۹۸۷ء بروز جمعہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہوکر کراچی ایئرپورٹ پہنچ کر تقریباً چھ بجے شام کو بذریعہ سعودی ایئرلائنز ریاض روانہ ہوا، اور تقریباً تین گھنٹے میں سعودی عرب کے وقت کے مطابق شام سات بجے ریاض ایئرپورٹ پہنچ گیا، جہاں مغرب کی نماز پڑھ کر سیدھا جامعۃ الملک سعود پہنچ کر اپنی آمد سے جامعہ کے ذمہ داروں کو آگاہ کردیا جنہوں نے قیام ودیگر ضروریات کا فوری طور پر انتظام کردیا۔ احقر کا داخلہ ''وحدة اللغة والثقافة'' میں ہوا تھا جو کہ معهد اللغة العربية کے تین شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ ایک ہفتہ رہائش کے انتظام، تعلیمی درسگاہوں کی تعیین، ضروری اور قانونی کاغذات کی فراہمی میں خرچ ہوا۔ اس ابتدائی ہفتہ میں دو مرتبہ اپنے استاذ و مرشد حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کو اور ایک مرتبہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری[1] مدظلہم کو خواب میں دیکھا جس سے یہ امید قائم ہوگئی کہ اپنے بڑوں کی دعائیں اور توجہات شامل ہیں۔

بروز ہفتہ ۸/ماہِ صفر ۱۴۰۸ھ تعلیم کا آغاز ہوا، میں اپنے اسباق میں تو برابر حاضری دیتا رہا، البتہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے دل کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا رہا:

منزلِ دوست چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

[1]) ہفتہ کی شب ۲۳ شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ مئی ۲۰۱۷ء کو حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کا وصال ہوگیا۔ رحمہ اللہ ۱۲

اور صورت حال یہ تھی کہ جامعۃ الملک سعود کی تحریری اجازت کے بغیر ہم ریاض سے باہر نہیں جا سکتے تھے، اور تعلیمی ایام میں جامعہ کی طرف سے اجازت ملنا دشوار تھا، لہٰذا اسی بے چینی کی کیفیت میں تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزر گیا، بالآخر ایک مختصر وقت کے لیے عمرہ کی ادائیگی کی غرض سے جامعہ سے تحریری اجازت نامہ حاصل کرنے میں بحمد اللہ! کامیابی ہوئی اور ہم لوگ چار ساتھی جن میں سے ایک مولوی محمد اشرف علی صاحب جن کا تعلق سرگودھا پاکستان سے تھا اور آج کل جامعہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا کے مہتمم ہیں، دوسرے مولوی عبدالستار صاحب جن کا تعلق لودھراں ملتان سے تھا، تیسرے جناب دوست محمد صاحب جن کا تعلق سرگودھا سے تھا اور چوتھا راقم السطور تھا۔ ہم نے مل کر ایک کار کرایہ پر لی اور بروز منگل ۱۷/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۰/نومبر ۱۹۸۷ء جامعۃ الملک سعود ریاض سے حرمین شریفین کی پہلی حاضری کے ارادہ سے اپنی پوری زندگی کے اس یادگار سفر پر روانہ ہوگئے۔ راستہ میں اس تصور سے کہ ہم ان شاء اللہ! عنقریب کعبۃ اللہ (حرسھا اللہ) کی زیارت اور روضۂ رسول (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر حاضری کی سعادت سے بہرہ ور ہونے والے ہیں، ہماری کیفیت ایسی ہو جاتی کہ اس کو تحریر میں لانا میرے کمزور قلم کے بس سے باہر ہے۔

واضح رہے کہ میرے مذکورہ تینوں ساتھیوں کو ''چنیوٹ'' صوبہ پنجاب پاکستان میں واقع حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ کے مدرسہ ''ادارۃ الدعوۃ والارشاد'' کی معرفت سے جامعۃ الملک سعود میں داخلہ ملا تھا، اور حرمین شریفین کی زیارت سے یہ حضرات بھی پہلی بار مشرف ہو رہے تھے، اس لیے ہم سب کی کیفیت تقریباً یکساں تھی۔

مرکزِ تجلیات کی پہلی زیارت

بہرصورت! ہم لوگ منگل اور بدھ کی درمیانی شب مکہ مکرمہ پہنچے اور تقریباً رات کے دو بجے ذرا فاصلہ سے مسجد حرام کے مبارک میناروں کی زیارت ہوئی، اور یہ تصور قائم رہا کہ یہ وہ مسجد حرام ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار فرمایا ہے، اور ہمیں ان شاء اللہ! چند ہی منٹ بعد اس مبارک مسجد کے اندر حاضر ہونے اور کعبۃ اللہ کی زیارت کرنے کا موقع ملنے والا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تھوڑی دیر بعد ہم دنیا کی اس جنت میں پہنچ کر کعبۃ اللہ کی زیارت سے مستفیض ہونے لگے، ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ ہم کعبۃ اللہ کی اس پہلی زیارت اور عمرہ کی ادائیگی سے رات کے اس حصے میں فیض یاب ہو رہے تھے جس میں حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی خاص شانِ رحمت کے ساتھ بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور خود ہی ان کو دعا اور سوال واستغفار کی ترغیب دیتا ہے، حدیث نبوی ملاحظہ ہو:

”عن أبي هريرة -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ينزل ربنا تبارك وتعالى كل ليلة إلى السماء الدنيا حين يبقى ثلث الليل الآخر، يقول: من يدعوني فأستجيب له؟ من يسألني فأعطيه؟ من يستغفرني فأغفر له؟“ (متفق عليه)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارا مالک اور رب تبارک وتعالیٰ ہر رات کو جس وقت آخری تہائی رات باقی رہ جاتی ہے سماءِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، اور ارشاد فرماتا ہے: کون ہے جو مجھ سے دعا کرے، تاکہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے،

تا کہ میں اس کو عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے، تا کہ میں اس کو بخش دوں؟۔" (صحیح بخاری و مسلم)

غور کیا جائے! مسجد حرام کی فضا ہو، مرکزِ تجلیات سامنے ہو، حجر اسود کو بوسہ دینے اور کعبۃ اللہ کے اردگرد طواف کرنے کا وقت آ گیا ہو، ملتزم سے لپٹنے اور ربّ کعبہ کے سامنے اپنی معروضات پیش کرنے کا ایک بہترین موقع مل رہا ہو، آبِ زمزم کے ذریعہ ظاہری اور روحانی طور پر سیراب ہونے کی سہولت میسر ہو رہی ہو، اور حسن اتفاق سے رات کا وہ حصہ چل رہا ہو جس میں اللہ تعالیٰ خود اپنے عاجز بندے کو دعا، سوال اور استغفار کرنے کی دعوت دے رہا ہو، اور ہو بھی کعبۃ اللہ کی پہلی زیارت، جس کی تمنا میں سالوں سال بیت چکے ہوں! ایسے ماحول میں زائر کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ اس کی تمام پریشانیاں کافور ہو جاتی ہیں اور دل کو ایک ایسا سکون ملتا ہے جس کو تحریر میں پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا:

ذوقِ ایں مئے نہ بدانے بخدا تا نہ چشے

اور زائر کا دل زبانِ حال سے اِس کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

اور دنیا کی اِس رحمت کو سامنے رکھتے ہوئے آخرت کی جنت اور جنت والوں کی اُس کیفیت کو بھی یاد کر لیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ میں ذکر فرمایا ہے:

"وَقَالُوْا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ" (الفاطر: ۳۴)

ترجمہ: ''اور جنت والے (جنت میں داخل ہونے کے بعد) کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا، بے شک ہمارا پروردگار بخشنے والا قدردان ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مذکورہ بالا کیفیت کے ساتھ ہم لوگ فجر کی اذان سے پہلے عمرہ کی ادائیگی سے فارغ ہوگئے، تھوڑی دیر بعد حرمِ پاک کی پُرکیف فضا میں فجر کی اذان دلوں کو جھنجھوڑنے لگی، جس کی تکبیروں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شہادتیَن سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا اعلان ہورہا تھا: حي على الصلوة، حي على الفلاح اور الصلوة خير من النوم سے نماز کی اہمیت اُجاگر ہورہی تھی اور نماز و کامیابی کی طرف آگے بڑھنے کی دعوت دی جارہی تھی، حرمِ پاک کی در و دیوار سے ٹکراکر اذان کے یہ کلمات جب کانوں میں پہنچتے تو غفلت میں ڈوبے ہوئے قلوب کو جگا دینے کے لیے کافی ہوجاتے، اذان و نماز کے درمیان وقفہ کے اندر فجر کی دو سنتیں پڑھنے اور اس بات پر غور کرنے کا موقع ملا کہ تھوڑی دیر کے بعد جس مسجد میں باجماعت نماز شروع ہونے والی ہے، وہ اُن تین مساجد میں سے ایک ہے جن کے لیے صحیح حدیث کے مطابق رختِ سفر باندھنے کی اجازت دی گئی ہے، اور جن میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مساجد کی ایک کثیر تعداد نمازوں سے زیادہ بتایا گیا ہے، اسی پر غور کرتے ہوئے نگاہیں کعبۃ اللہ کے مبارک منظر سے محظوظ ہورہی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد فجر کی نماز امامِ حرم کی اقتداء میں شروع ہوگئی، اور روئے زمین کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مہمانانِ حرم نے کعبۃ اللہ کے اردگرد صفیں باندھ کر کندھوں سے

کندھے ملا دیئے، جب تلاوتِ قرآن شروع ہوئی تو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسا کہ قرآن کا نزول ہورہا ہو اور دل یہ چاہ رہا تھا کہ یہ تلاوت جلدی ختم نہ ہو، نمازِ فجر کے بعد دوپہر تک آرام کیا، اور دوپہر کو اُٹھ کر پہلے کھانا کھایا اور پھر حرم حاضری ہوئی، ظہر سے عصر تک حرم میں رہے اور عصر کے بعد ہم سب ساتھیوں نے غارِ حرا جانے کا پروگرام بنایا۔

غارِ حراء کی زیارت

مسجدِ حرام سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر منیٰ جاتے ہوئے بائیں طرف ایک پہاڑ ''جبلِ نور'' کے نام سے واقع ہے، اس پہاڑ کی چوٹی پر غارِ حراء ہے، جہاں سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نبوت ملنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے خلوت گزینی اختیار فرمائی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کھانے پینے کا کچھ ضروری سامان ساتھ لے کر تشریف لے جاتے، اور کئی کئی دن خلوت فرماتے، ''الدر المختار'' (ج:۱،ص: ۲۶۳) کی تصریح کے مطابق غارِ حراء میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دینِ ابراہیمی کے مطابق عبادت فرماتے، اور جب سامان ختم ہوجاتا تو واپس تشریف لاتے اور کچھ ضروری سامان لے جاتے اور پھر خلوت گزینی اختیار فرماتے، غارِ حراء کا سائز اتنا ہی ہے کہ کوئی معقول قد کا آدمی تنہا اس میں بیٹھ سکتا ہے، لیٹ سکتا ہے اور کھڑا بھی ہوسکتا ہے، اس غار کے بند دہانے میں ایک عمودی پتلی سی درز ہے، جس سے اُس زمانے میں کعبۃ اللہ صاف نظر آتا تھا، البتہ آج کل مسجدِ حرام کی اونچی عمارت کی وجہ سے کعبۃ اللہ تو نظر نہیں آتا، مسجدِ حرام کی عمارت نظر آتی ہے۔

غارِ حراء میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلوت گزینی کا سلسلہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل علیہ السلام پہلی وحی لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''اقرأ'' (پڑھیے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پڑھنا جانتے ہیں، حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دبوچا اور خوب دبوچا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوت جواب دینے لگی، پھر چھوڑ دیا اور کہا: ''اقرأ'' (پڑھیے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے پھر اسی طرح دبوچا اور پھر چھوڑ کر کہا: ''اقرأ'' (پڑھئے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب پھر بھی وہی رہا، حضرت جبریل علیہ السلام نے جب تیسری مرتبہ اُسی طرح دبوچا اور پھر چھوڑ دیا تو کہا: ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ،خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ،اقْرَأْ وَرَبُّکَ الْأَکْرَمُ'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر تحمل وحی کی استعداد پیدا ہو چکی تھی ،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھنا شروع کر دیا اور یہیں سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک جاری رہا۔

بہر صورت! غارِ حراء کی زیارت کے لیے ہم چاروں ساتھی بروز بدھ ۱۸ر ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱ر نومبر ۱۹۸۷ء بعد العصر جبل نور پہنچ گئے، اور پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا، پہاڑ کی چڑھائی درمیان تک زیادہ کٹھن نہ تھی، درمیانی بلندی سے اوپر پہاڑ کی چوٹی تک جانے میں بڑی احتیاط و ہمت کی ضرورت تھی، اس لیے کہ پہاڑ کے ایسے حصوں سے بھی گزرنا پڑتا جہاں چڑھنے والا اپنا جسم ترچھا کر کے پنجوں اور پاؤں کی مدد سے آگے سرکتا ہوا بڑھ سکتا تھا، احقر کے دل میں یہ احساس موجزن تھا کہ جن پتھروں کو آج ہم چھو رہے ہیں یہ وہی پتھر تو ہیں جن کو تقریباً چودہ

سوا کتیس سال قبل (۱۴۰۸ھ کے اعتبار سے) نبی کریم ﷺ نے چھوا تھا، اور جن پر آپ ﷺ کی مبارک نظریں ضرور پڑی ہوں گی اور اس پر بھی غور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ توسنِ کہولت میں اس دشوار گزار پہاڑی کی چوٹی پر واقع غارِ حراء تک بار بار تشریف لے جا چکے ہیں، اور آپ ﷺ کے اُمتی ہونے کا دعویدار یہ سیاہ کار اپنی جوانی (میری عمر اس وقت چھبیس سال کے لگ بھگ تھی) میں ہمت ہار کر صرف ایک مرتبہ چڑھنے میں بھی کاہلی سے کام لے تو یہ ہرگز مناسب نہیں، شاید اسی احساس وجذبے نے احقر کو اپنے ساتھیوں سے پہلے اور راستے میں توقف کیے بغیر غارِ حراء تک پہنچا دیا۔

اس تاریخی سفر کے بعد سے تادمِ تحریر جو تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اپنے رفیقِ سفر جناب مولانا محمد اشرف علی صاحب سے وقفہ وقفہ سے دو ملاقاتیں اور ایک مرتبہ فون پر بات ہوئی ہے، تینوں دفعہ انہوں نے جبل نور پر احقر کے چڑھنے کے انداز کا تذکرہ ضرور فرمایا ہے، غارِ حراء میں کم از کم دو رکعت نفل نماز ادا کرنے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن چونکہ ہم لوگ عصر پڑھ کر نکلے تھے، اس لیے نوافل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، اور زیارت ودعاؤں پر اکتفاء کرتے ہوئے ہم لوگ واپس ہو گئے۔

غارِ حراء کی زیارت سے تین باتوں کا ذہن نشین ہو جانا

غارِ حراء کا دشوار گزار راستہ طے کرنے اور اس کی زیارت کرنے کے موقع پر تین باتیں خاص طور پر ذہن نشین ہو گئیں:

پہلی بات: ہر داعیِ حق، عالمِ دین اور خادمِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غارِ حراء جانے کے لیے جبل نور پر بار بار چڑھنے کی مشقت کو سہنے اور اس کے بعد ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں گوناگوں تکالیف جھیلنے اور مخالفین کی اذیتوں پر صبر کرنے کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی میں مشقت برداشت کرنے، محنت کرنے اور سادگی اختیار کرنے کو ترجیح دے، تاکہ وہ دعوت و تبلیغ، دینی علوم کی تعلیم اور آوازِ حق پھیلانے کے لیے درکار محنت کا عادی بن کر مخالفین کی اذیتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار رہے، اور اگر خدانا خواستہ اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کو چھوڑ کر دنیاداروں اور تعیش پرستوں کے طرزِ زندگی کو اختیار کیا اور آرام طلبی و سہولت پسندی اس کے مزاج میں داخل ہوگئی تو ایسی صورت میں نہ تو وہ دینی تعلیم و تبلیغ کے لیے بے لوث محنت کر سکے گا، اور نہ ہی مخالفین کی اذیتوں پر صبر کرنے کا مادہ اپنے اندر پائے گا، اور بالآخر دنیاداروں اور سہولت پسندوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ والعیاذ باللہ۔

دوسری بات: ایک عام مسلمان اور بالخصوص عالمِ دین و داعیِ حق کے لیے چاہیے کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے کھانے پینے میں احتیاط برتے، تاکہ جسم فربہ نہ ہونے پائے اور پیٹ اپنے حدود میں رہے، اس لیے کہ جسم فربہ ہونے اور پیٹ باہر کی طرف نکلنے کی صورت میں تگ و دَو مشکل ہوتی ہے، اور بوقتِ ضرورت دشوار گزار راستوں کو عبور کرنا اور اونچائیوں پر چڑھنا دشوار ہو جاتا ہے، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بار بار جبل نور پر چڑھنا اور کئی کئی دن تک کھانے پینے کے ایک معمولی سامان پر اکتفا کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا

جسم مبارک چست، موزوں اور اپنے کنٹرول میں تھا، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ھند بن ابی ھالہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو حلیہ مبارک نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی ہے: ''سواءُ البطن والصدر'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیٹ اور سینہ مبارک دونوں ہموار تھے، اور اسی روایت میں آگے یہ لفظ بھی ہے: ''ذَریع المِشیة'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیز رفتار تھے۔ (شمائل ترمذی، ص: ۲)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری کے اندر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بعد میں آنے والے ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جو خیانت اور دیگر گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ ان میں موٹاپا ظاہر ہوجائے گا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''إنّ بعدکم قومًا یخونون ولایؤتَمَنون ویشهدون ولا یُسْتشهدون ویَنْذرون ولایَفون ویظهر فیهم السِّمَن''

''بے شک تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو خیانت کریں گے اور امانت داری سے کام نہیں لیں گے، اور گواہی دیں گے جب کہ وہ گواہ نہیں بنائے گئے ہوں گے، اور منتیں مانیں گے اور اُنہیں پوری نہیں کریں گے، اور ان میں موٹاپا ظاہر ہوجائے گا۔''

مذکورہ حدیث کی تشریح میں بخاری شریف کے حاشیہ کے اندر کرمانی کے حوالہ سے لکھا ہوا ہے:

''یعنی لوگوں کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا اور دنیوی خواہشات کے پیچھے چلنا رہ جائے گا، آخرت سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔''

راقم عرض کرتا ہے کہ ایسے لوگوں پر سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا مندرجہ ذیل شعر

بھی منطبق ہوتا ہے:

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
ایں معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

تیسری بات: مصلحینِ امت ومشائخ طریقت نے مدارجِ سلوک طے کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے کے لیے چلّہ کشی اور گوشہ نشینی کو جو اہمیت دی ہے، اُس اہمیت پر غارِ حراء کے واقعہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے، چنانچہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۵۰۵ھ) نے اپنی مایۂ ناز کتاب ''احیاء علوم الدین'' جلد ثانی میں گوشہ نشینی کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اس کے چھ فوائد ذکر کیے ہیں، اور فائدہ اولیٰ کو بیان کرتے ہوئے اس کے ضمن میں غارِ حراء کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلوت وگوشہ نشینی سے استدلال فرمایا ہے۔

اسی طرح حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند مدظلہم العالی نے تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد اول، ص: ۱۳۹ پر خلوت گزینی کی افادیت کو بیان کرتے ہوئے اپنے شیخ حضرت مولانا زکریا صاحب قدس سرہٗ کا یہ ملفوظ نقل فرمایا ہے:

> ''جس نے لوگوں سے دوری اختیار کی اور تنہائی کو پسند کیا وہ اگر ٹھیکری (مٹی کے برتن کا بے وقعت ٹکڑا) بھی ہوگا تو ہیرا بن جائے گا، اور جو لوگوں کے ساتھ تعلقات کا خواہاں ہوتا ہے اور یارانہ گانٹھنے کا شوقین ہوتا ہے وہ اگر ہیرا بھی ہوگا تو ٹھیکری بن جائے گا۔''

غارِ حراء کی زیارت سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس مسجدِ حرام آ گئے، اور چونکہ

اگلے دن ہی مدینہ منورہ جانا تھا، اس لیے کوشش یہ رہی کہ جو مختصر وقت ہمارے پاس ہے اس کا بیشتر حصہ مسجدِ حرام کی بابرکت فضاء میں گزر جائے، چنانچہ پوری رات مسجدِ حرام میں رہے، اور اگلے دن مدینہ منورہ جانے کا پروگرام بنایا۔

کعبۃ اللہ کا الوداعی طواف

ہمیں چونکہ بہت مختصر وقت کے لیے جامعۃ الملک سعود ریاض سے عمرہ اور زیارتِ حرمین شریفین کے لیے تحریری اجازت نامہ ملا تھا، جس کے تحت ہم بروز منگل ۱۷/ربیع الاول کو ریاض سے روانہ ہوگئے تھے، اور بروز ہفتہ ۲۱/ربیع الاول کو واپس ریاض پہنچ کر جامعہ میں صبح کے وقت اپنے اسباق میں حاضری دینی تھی، اس مختصر وقت میں ہمیں عمرہ بھی کرنا تھا، اور مدینہ منورہ جا کر مسجد نبوی اور روضۂ اقدس پر حاضری بھی دینی تھی، اس لیے بروز جمعرات ۱۹/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۲/نومبر ۱۹۸۷ء رخصت ہونے کے ارادہ سے کعبۃ اللہ کا طواف کر کے ملتزم پر آ کر حزن و ملال اور اس دعا کے ساتھ رخصت ہوئے کہ:

> ''یا اللہ! یا مجیب الدعوات! بار بار صحت و عافیت، ایمان و یقین اور استقامت و مخلصانہ محبت کے ساتھ حاضری کی توفیق عنایت فرما۔''

حرمین شریفین کی زیارت کے لیے بچپن سے جو تمنائیں دل میں موجزن تھیں ان تمناؤں کی تکمیل اگرچہ اتنے مختصر وقت میں نہیں ہوسکتی تھی اور ہمیں ایک مختصر حاضری کے بعد دوبارہ فراق وجدائی کا حزن و ملال لاحق تھا، اور دل میں ایک بے چینی کی کیفیت تھی، اس بے چینی کی کیفیت میں احقر کبھی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا کہ تم اتنے مختصر وقت میں کیوں واپس جا رہے ہو؟ اُدھر سے جواب ملتا کہ جب

وقت ہی مختصر ملا تو اب کیا کہا جا سکتا ہے؟ میرے اس ''مکالمۂ نفسی'' پر حافظ شیرازیؒ کا مندرجہ ذیل شعر منطبق ہورہا تھا:

گفتم کہ نہ وقتِ سفرت بود چنین روز
گفتا کہ مگر مصلحتِ وقت چنیں بود

دردِ فراق کی وجہ سے اگرچہ ہمیں غیر اختیاری ملال لاحق تھا، تاہم اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام پر کہ اس نے اپنے دربار میں حاضری، کعبۃ اللہ کی زیارت اور طواف اور غلافِ کعبہ پکڑنے کا موقع عنایت فرمایا ہے، ہمارے قلوب غمِ فراق کے ساتھ ساتھ شکرِ خداوندی کے جذبات سے بھی لبریز تھے، اور بقول شاعر ہماری کیفیت کچھ اس طرح بھی تھی:

نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است　　افتم بہ پائے خود کہ بہ کویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ دہم دست خویش را　　کو دامنت گرفتہ بہ سویم کشیدہ است

ترجمہ ومفہوم: ''مجھے اپنی آنکھوں پر فخر ہے جنہوں نے آپ کے جمال کا نظارہ کیا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ ہر گھڑی اپنے ہی ہاتھوں کو ہزاروں بوسے دیا کروں، کیونکہ انہوں نے آپ کا دامن پکڑ کر میری طرف سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔''

مدینہ منورہ روانگی

بروز جمعرات کعبۃ اللہ کا الوداعی طواف کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی حاضری کے ارادہ سے ہم چاروں روانہ ہوگئے، راستہ میں کبھی یہ تصور قائم ہوتا کہ حرمین شریفین کے درمیان کا راستہ آقائے دو جہاں ﷺ نے اپنے یارِ غار ورفیقِ سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت فرماتے ہوئے کتنی مشقت کے ساتھ طے کیا تھا! اور آج ان کی قربانیوں کی بدولت وہی راستہ ہم لوگ کتنی آسانی

اور امن و امان کی فضا میں طے کر رہے ہیں! ان نعمتوں کا شکر ہم کیسے ادا کریں گے!
اور کبھی ان پہاڑیوں اور ریگستانوں کو جو اپنی پرانی حالت پر باقی تھے اور نئے نئے
روڈوں اور جدید تعمیرات نے ان کے حلیہ کو متاثر نہیں کیا تھا، اس وجہ سے ہم
خصوصی طور پر محبت و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ شاید مکہ مکرمہ اور مدینہ
منورہ کے درمیان آتے جاتے ان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
کے مبارک قدموں کے نشانات یا مبارک نظریں پڑی ہوں گی، ان ہی تصورات
کے ساتھ جیسے جیسے ہم لوگ آگے بڑھتے رہتے، شوقِ مدینہ میں اضافہ ہوتا رہتا:

کسی چیز کی اس کو حسرت نہیں ہے
میسر ہو جس کو غبارِ مدینہ

مسجدِ قبا کی زیارت اور اس کا ذکرِ خیر

ہم لوگ حسبِ توفیق درود شریف کا وِرد کرتے ہوئے مندرجہ بالا تصورات
کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف والہانہ انداز میں بڑھ رہے تھے، یہاں تک کہ عصر
تک محلہ ''قباء'' میں پہنچ کر عصر کی نماز ''مسجد قباء'' میں ادا کی، قباء نبی کریم کے دور
میں مدینہ منورہ کی بالائی جانب تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ایک گاؤں کا نام
تھا، جہاں قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے لوگ آباد تھے، اب وہ مدینہ منورہ میں شامل
ہوگیا ہے، بخاری شریف جلد اول، صفحہ نمبر: ۵۵۹ تا ۵۶۰ کی روایت کے مطابق
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے قبل یہاں پر قیام
فرمایا تھا، اور چودہ دن رہے تھے، بخاری شریف جلد اول، صفحہ: ۵۵۵ کی ایک
اور روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی دوران اُس مسجد (مسجدِ قباء) کی بنیاد

رکھی، جس کے بارہ میں (قرآن پاک کے اندر) فرمایا گیا ہے: ''أُسِسَ علی التقویٰ'' یعنی وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''البدایۃ والنھایۃ'' جلد ثانی، صفحہ: ۵۹۹ پر ایک حدیث کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس مسجد میں جانبِ قبلہ کی نشاندہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمائی تھی، اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں عام مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے یہی مسجد بنائی گئی، ہاں! ایک مسجد اس سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے گھر کے دروازہ کے پاس ضرور بنائی تھی، لیکن وہ صرف اپنی ذاتی عبادت کے لیے تھی، عام مسلمانوں کے لیے نہیں تھی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس مسجد کا تذکرہ بخاری شریف کی روایت میں صفحہ: ۵۵۳ جلد اول میں بھی موجود ہے۔

حاصل یہ! کہ ''مسجد قباء'' عام مسلمانوں کے لیے بنائی گئی سب سے پہلی مسجد ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس کی بنیاد رکھی ہے، اور اس کی تعمیر میں بھی حصہ لیا ہے، اس مسجد کا ذکر خیر قرآن پاک سورۂ توبہ آیت: ۱۰۸ میں بھی موجود ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ہفتہ کے دن کبھی سواری پر اور کبھی پیدل ''مسجدِ قباء'' تشریف لے جایا کرتے تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہر ہفتہ کے دن ''مسجدِ قباء'' تشریف لے جایا کرتے تھے، اور وہاں پر دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ (بخاری شریف، ج:۱،ص:۱۵۹)

اسی طرح امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت اُسید بن

ظہیر انصاری اور حضرت سہل بن حُنیف رضی اللہ عنہما کی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

''مسجد قباء کی نماز کا ثواب عمرہ کے ثواب کے برابر ہے''۔

(ترمذی، ج:۱،ص: ۴۷۔نسائی، ج:۱،ص: ۱۱۴۔ابن ماجہ: ۱۰۲)

مسجدِ قباء کے مذکورہ بالا فضائل کو سامنے رکھتے ہوئے جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجد اقصیٰ کے بعد تمام مساجد میں سب سے افضل مسجدِ قباء ہے، ہم سب رفقائے سفر کو اس بات پر خوشی تھی کہ ہمیں اس مسجد کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کی سعادت ملی، اور خود بخود ایک ایسی صورت بن گئی کہ ہمیں مسجدِ نبوی کے حدود تک پہنچنے سے قبل مسجدِ قباء کے حدود میں عصر کی نماز کی ادائیگی کے لیے رُکنا پڑا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سفرِ ہجرت کے ساتھ ایک ادنیٰ شباہت کی صورت پیدا ہوگئی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے یہاں قیام فرمایا تھا۔

مسجدِ قباء سے مسجدِ نبوی کی حاضری کے لیے روانگی

عصر کی نماز اور مسجدِ قباء کی زیارت سے فارغ ہو کر ہم مسجدِ نبوی کی طرف روانہ ہوگئے، تھوڑی دیر کے بعد مسجدِ نبوی کے پُرنور میناروں اور مزید آگے چل کر باعظمت گنبدِ خضراء پر نظریں جم گئیں، دل دھڑکنے اور آنسو ٹپکنے لگے، اور آگے چونکہ مسجدِ نبوی اور روضۂ اقدس پر حاضری کا مرحلہ تھا، تو کبھی اس سوچ کا غلبہ ہوجاتا کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مواجہہ شریف پر اپنی بداعمالیوں اور اپنے گناہ گار وخطاکار چہرے کے ساتھ حاضری دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، لہٰذا! اَقدامِ عالیہ

کی جانب سے اپنی نظریں چھپا کر سلام پیش کرنا میرے حق میں مناسب ہوگا، پھر یہ خیال آتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اپنی جان کے دشمنوں تک کو بھی معاف فرماتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والوں میں سے ہر شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اچھے سلوک و بلند اخلاق کو دیکھ کر یہ تصور کرتا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ مجھ سے محبت فرماتے ہیں، اور خود رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں سورۂ توبہ آیت: ۱۲۸ میں ارشاد فرمایا ہے:

''حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ''

ترجمہ: ''وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند رہتے ہیں اور مسلمانوں پر نہایت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔''

اسی طرح سورۂ نساء آیت نمبر: ۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَآؤُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوْا اللهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا''

ترجمہ: ''اور جب لوگوں نے (تمہاری نافرمانی کر کے) اپنے اوپر ظلم کیا تھا، اگر اسی وقت تمہارے پاس حاضر ہوجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے لیے بخشش طلب کرتے تو یہ لوگ دیکھ لیتے کہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

آیتِ مذکورہ کے حکم کا تعلق اگرچہ براہِ راست تو کسی ایسی جماعت سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھی، تاہم اربابِ علم اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزارِ اقدس پر حاضری دینے والوں سے بھی جوڑ دیتے ہیں، یہاں تک کہ مشہور مفسّر و محدّث حافظ عماد الدین

اسماعیل بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۷۷۴ھ) نے اپنی مایۂ ناز تفسیر میں آیتِ مذکورہ کے تحت ''عُتبی'' رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مشہور قصہ نقل کیا ہے:

''میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزارِ اقدس کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صحرا نشین شخص آیا اور ''السلام علیك یارسول الله!'' کہہ کر عرض کرنے لگا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے، جو فرماتے ہیں: '' وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَّلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ جَآؤُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوْا اللهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا '' اور میں اپنے گناہوں پر استغفار کرتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور اپنے پروردگار کے حضور میں آپ سے شفاعت کی التجاء کرتا ہوں۔ پھر مندرجہ ذیل دو نعتیہ شعر پڑھ کر چلا گیا:

یاخیر من دفنت بالقاع أعظُمُه فطاب من طیبهنَ القاعُ و الأکَم
نَفسی الفداء لِقبرٍ أنت ساکنه فیه العفافُ و فیه الجودُ و الکرمُ

ترجمہ: ''اے ان تمام ہستیوں سے برتر ہستی! جن کی ہڈیاں (اجسام مبارکہ) ہموار زمین میں دفن ہو چکی ہیں، اور ان کی خوشبو سے ہموار زمین و پہاڑیاں مہک اُٹھی ہیں، میری جان قربان ہو اس قبر پر جس میں آپ آرام فرما رہے ہیں، اس قبر میں تو پاک دامنی اور جود و کرم سب قیام پذیر ہیں۔''

عُتبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ شخص تو چلا گیا اور مجھے نیند آ گئی اور خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے عُتبی! اس صحرا نشین شخص سے جا کر ملو اور یہ خوشخبری سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔'' (تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۵۶۳، مطبوعہ ریاض)

احقر کہتا ہے کہ اس موقع پر اُس مرفوع حدیث نبوی کی طرف بھی ذہن منتقل ہوا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضری دینے

کی ترغیب دی گئی ہے، اور اُس حاضری کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، مذکورہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ مروی ہے، اور ہر سند پر انفرادی طور پر اگرچہ محدثین نے کلام کیا ہے، تاہم امام ذہبی، ابوعلی بن السکن، تقی الدین سبکی اور شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہم جیسے محدثین نے کثرتِ طرق کی بنیاد پر اس کی اہمیت ومضبوطی کو تسلیم کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو: التلخیص الحبیر لابن حجر، ج:۲،ص:۵۷۰، مطبوعہ بیروت۔فیض القدیر شرح الجامع الصغیر للمناوی، ج:۶،ص:۱۴۰، مطبوعہ بیروت)

مذکورہ بالا وجوہات اور اُمتِ مسلمہ کا قرناً بعد قرنٍ آپ کے مزارِ اقدس پر حاضری دینے کے لیے سفر کرنے کے تعامل کو مدنظر رکھتے ہوئے جمہور علماء نے اس حاضری کو افضل المندوبات اور اعظم القربات بلکہ بعض نے تو (اہل استطاعت کے لیے) واجب قرار دیا ہے۔

(ملاحظہ ہو: معارف السنن للشیخ العلّامۃ البنوری، ج:۳،ص:۳۲۹ تا ۳۳۵)

خلاصہ یہ کہ مسجدِ قباء اور مسجدِ نبوی کے درمیان کا راستہ طے کرنے کے دوران اپنی کوتاہیوں پر غور کرتا ہوا شروع شروع میں اپنے اندر یہ ہمت نہیں پا رہا تھا کہ مسجدِ نبوی میں حاضری کے بعد سلام پیش کرنے کے لیے مواجہہ شریف پر حاضری دوں گا، بلکہ اپنے حق میں یہی بہتر سمجھتا تھا کہ اَقدامِ عالیہ کی جانب سے سلام پیش کروں گا، لیکن جب مندرجہ بالا امور کا اجمالی طور پر ذہن میں استحضار ہوا تو کچھ ہمت سی پیدا ہوگئی، اور یہ بات ذہن نشین ہونے لگی کہ اپنی زیادتیوں اور بداعمالیوں کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔جن کی صفت ''حَرِيْصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ'' ہے۔ کے دربارِ عالی میں شرمندگی وندامت کے احساس کے ساتھ مواجہہ شریف کی جانب سے حاضر ہونا مناسب رہے گا۔

روضۂ مبارک پر حاضری اور سلام پیش کرنے کی سعادت

روضۂ اقدس پر جب مواجہہ شریف کی جانب سے سلام پیش کرنے کا مرحلہ سامنے آیا، اور یہ تصور بھی قائم ہو گیا کہ آج تو صیغۂ حاضر کے ساتھ صلاۃ وسلام پیش کرنے کا موقع نصیب ہو رہا ہے، اور اس حدیث کا تصور بھی جو امام احمد بن حنبل اور امام ابوداؤد رحمہما اللہ نے مضبوط سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے موقع پر سلام کا جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔

(التلخیص الحبیر، ج:۲، ص:۵۷۰)

اس تصور سے دل ودماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی جس سے وہ ساری تمنائیں اور حاجتیں ذہن سے غائب ہوگئیں جن کے متعلق چلتے وقت یہ منصوبہ بنایا تھا کہ روضۂ اقدس پر حاضری کے دوران سلام پیش کرنے کے بعد ان تمناؤں اور حاجتوں کے حصول کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کروں گا، اس لیے کہ بارگاہِ نبوی میں حاضری کی تمنا جب پوری ہوگئی تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ تمام تمنائیں پوری ہوگئیں، اب مزید کسی تمنا کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اُس وقت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر میری کیفیت پر منطبق ہو رہا تھا:

اربابِ حاجتیم وزبانِ سوال نیست
در حضرتِ کریم تمنا چہ حاجت است؟

ترجمہ ومفہوم: ''ہم حاجت مند تو بے شک ہیں، لیکن زبان میں سوال کرنے کی ہمت نہیں رہی، کیونکہ دربارِ کریم میں حاضری کی تمنا جب پوری ہوگئی تو مزید کسی تمنا کی ضرورت کیا ہے؟۔''

بہرصورت! صلوٰۃ وسلام کے کلمات عربی زبان میں ذرا پست آواز کے ساتھ

پیش کرنے کے بعد دل نے چاہا کہ فارسی زبان میں مولانا عبدالرحمن جامی ۷ (متوفّی ۸۹۸ھ) کے اس قصیدہ نعتیہ میں سے چند منتخب اشعار پڑھنے کی کوشش کروں جو بتیس اشعار پر مشتمل اور ان کی مشہور و معروف کتاب ''یوسف زلیخا'' کے شروع میں درج ہے، میں نے بچپن میں اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے پاس ''یوسف زلیخا'' پڑھتے ہوئے وہ قصیدہ پڑھا تھا، اور والد ماجد مجھے پڑھاتے ہوئے یا کبھی خود اُسے پڑھتے ہوئے آنسو بھی بہاتے تھے، اس قصیدہ سے متعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ''فضائل درود شریف'' میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب قدس سرہٗ کی زبانی ایک قصہ نقل کیا ہے جو نیچے درج کیا جا رہا ہے:

مولانا عبدالرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدہ نعتیہ کا قصہ

''مولانا جامیؒ یہ نعت کہنے کے بعد جب ایک مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو ان کا ارادہ یہ تھا کہ روضۂ اقدس کے پاس کھڑے ہو کر اس نظم کو پڑھیں گے، جب حج کے بعد مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا تو امیرِ مکہ نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ اس کو (جامی کو) مدینہ نہ آنے دیں، امیرِ مکہ نے ممانعت کر دی، مگر ان پر جذب و شوق اس قدر غالب تھا کہ یہ چھپ کر مدینہ کی طرف چلے، امیرِ مکہ نے دوبارہ خواب دیکھا! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ آ رہا ہے، اس کو یہاں نہ آنے دو، امیر نے آدمی دوڑائے اور ان کو راستہ سے پکڑوا کر بلایا، ان پر سختی کی اور جیل خانہ میں ڈال دیا، اس پر امیر کو تیسری مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: یہ کوئی مجرم نہیں بلکہ اس نے

کچھ اشعار کہے ہیں جن کو یہاں آ کر میری قبر پر کھڑے ہوکر پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے، اگر ایسا ہوا تو قبر سے **مصافحہ** کے لیے ہاتھ نکلے گا جس میں فتنہ ہوگا، اس پر ان کو جیل سے نکالا گیا اور بہت اعزاز و اکرام کیا گیا۔''

(فضائل درود شریف، ص: ۱۱۲، ۱۱۳)

اس قصیدہ کے چند منتخب اشعار یہ ہیں:

۱	زِ مہجوری برآمد جان عالَم	ترحّم یا نبیَّ اللہ! ترحّم
۲	نہ آخر رحمۃٌ للعالمینی	زِ محروماں چرا غافل نشینی
۳	بروں آور سرا از بُرد یمانی	کہ روئے تُست صبحِ زندگانی
۴	اگرچہ غرقِ دریائے گناہم	فتادہ خشک لب برخاکِ راہم
۵	تو ابرِ رحمتی آن بہ کہ گاہے	کنی برحالِ لب خشکاں نگاہے
۶	قضا می افگند از راہ مارا	خدارا از خدا در خواہ مارا
۷	کہ بخشد از یقیں اول حیاتے	دہد آنگہ بکارِ دیں ثباتے
۸	کند باایں ہمہ گمراہیٔ ما	ترا اذنِ شفاعت خواہیٔ ما

ترجمہ ومفہوم:

''۱-آپ کے فراق سے کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ جاں بلب ہے، اے رسولِ خدا! نگاہِ کرم فرمایئے!۔

۲-آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں، ہم بے نصیبوں سے آپ کیسے تغافل فرما سکتے ہیں؟

۳-اپنے سر مبارک کو یمنی چادروں کے کفن سے باہر نکالیے، کیونکہ آپ کا چہرۂ انور نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

۴-اگرچہ میں گناہوں کے دریا میں غرق ہوں، لیکن خشک ہونٹوں کے ساتھ آپ کی گردِراہ میں پڑا ہوا ہوں۔

۵- آپ چونکہ ابرِ رحمت ہیں، اس لیے بہتر ہوگا کہ کبھی تو تشنہ لبوں پر ایک نگاہِ کرم ڈال دیں۔

۶- تقدیر ہمیں صراطِ مستقیم سے بھٹکا رہی ہے، خدارا! ہمارے لیے خداوندِ قدوس سے دعا فرمائیے!

۷- (دعا یہ فرمائیے) کہ اللہ تعالیٰ اولاً تو ہمیں یقینِ کامل کی زندگی بخشے، اور پھر دینی کاموں میں ثابت قدمی عطا فرمائے۔

۸- (اور یہ بھی دعا فرمائیے) کہ اللہ تعالیٰ ہماری تمام برائیوں کے باوجود آپ کو ہماری شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے۔''

اس قصیدے نے چونکہ بچپن ہی سے اپنے والد ماجد کی کیفیت کو دیکھ کر احقر کو متأثر کر دیا تھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ کبھی دوسروں سے سن کر اور کبھی خود تنہائیوں میں پڑھتے ہوئے اور حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ کے نقل کردہ مذکورہ بالا قصہ پر غور کرتے ہوئے اس تأثر میں اضافہ ہوتا رہا، اس پرانی مناسبت نے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ آستانۂ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری کے وقت اس قصیدے میں سے چند وہ منتخب اشعار جو زبانی یاد ہو گئے تھے پڑھنے کی کوشش کروں، لیکن ہوا یہ کہ صرف ایک دو شعر رُک رُک کر پڑھنے کے بعد زبان گنگ ہوگئی اور مزید پڑھنے سے اپنی عاجزی ظاہر کر دی۔

زباں گنگ کیوں نہ ہوتی؟ جس دربار کی حاضری کو اللہ تعالیٰ کا مقرب فرشتہ حضرت جبریل علیہ السلام اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہو، جس ہستی سے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا ہو کہ:

''اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو، اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، اس طرح ان کے روبرو زور

سے نہ بولا کرو، (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو"۔ (الحجرات:۲)

اور جس ذاتِ اقدس کے دربار میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہوتا ہو، اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے متعلق یہاں تک فرمایا ہو کہ: "إذا قام في مقامك لم يُسمع الناسَ من البكاء" یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تو حالت یہ ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محراب میں کھڑے ہو گئے تو شدتِ گریہ کی وجہ سے لوگوں کو تکبیر و قرأت سنانے پر قادر نہیں ہو سکیں گے۔ (بخاری شریف، ج:۱، ص:۹۳) اور جن کی مجلس میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بات کرتے ہوئے کانپتے ہوں! ان کے آستانے کے سامنے گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا پندرہویں صدی ہجری کے پُرفتن اور دور اُفتادہ زمانے کا ایک سیاہ کار شخص کس طرح لب کشائی کر سکتا ہے؟

بشارتِ غیبی کا ایک واقعہ

احقر اس مضمون "حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری" کو اپنی تحریری اور ذہنی یادداشتوں کی روشنی میں ترتیب دینے لگا تھا اور شروع سے "روضۂ اقدس پر حاضری اور سلام پیش کرنے کی سعادت" والے عنوان تک لکھ چکا تھا، اور مذکورہ عنوان کے تحت بھی کچھ حصہ لکھ چکا تھا اور مزید لکھنے میں مصروف تھا کہ اسی دوران بروز منگل ۲۸/ ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۳/ اکتوبر ۲۰۱۵ء فجر کی نماز کے بعد اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور اسکرین پر ایک ایسا نمبر ظاہر ہو گیا جو میرے

پاس محفوظ نہ تھا، میری پوری توجہ چونکہ روضۂ اقدس پر پہلی حاضری کی یادوں کی طرف مرکوز تھی، اس لیے ایک مرتبہ تو سوچا کہ فون ہی وصول نہ کروں اور اپنی یادوں کے سلسلہ کو ٹوٹنے نہ دوں، پھر خیال آیا کہ یہ تو کسی مسلمان بھائی کے ساتھ ناانصافی ہوگی، لہٰذا میں نے فون وصول کر کے سلام کیا، اُدھر سے جواب کے بعد آواز آئی:

''میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری میں آپ کا رفیقِ سفر محمد اشرف علی سرگودھا سے بول رہا ہوں۔''

یہ سننا تھا کہ میری کیفیت کچھ عجیب سی ہوگئی، اس لیے کہ یہ ان ہی تین رفقائے سفر میں سے ایک تھے جن کا ذکرِ خیر اس سے پہلے اس مضمون میں کر چکا ہوں، ایک ایسے موقع پر کہ میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری سے متعلق تقریباً اٹھائیس سال گزرنے کے بعد مضمون لکھنے میں مصروف تھا اور مواجہہ شریف پر حاضری کا موضوع چل رہا تھا، غیر متوقع طور پر مولانا کی آواز اور ان کی زبان سے حرمین شریفین کا تذکرہ سن کر اُسے فالِ نیک اور بشارتِ غیبی سمجھا، اور مولانا کو اُسی وقت اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا کہ احقر اس وقت مواجہہ شریف پر حاضری کے عنوان کے تحت کچھ لکھ رہا تھا اور آپ میری یادوں میں میرے ساتھ تھے، مولانا نے فرمایا کہ: میں نے اپنی مسجد میں فجر کی نماز پڑھائی، پھر درسِ قرآن دیا، اس کے بعد اُسی جائے نماز پر بیٹھا ہوا نمازِ اشراق کے انتظار میں کچھ وظائف و اَوراد پڑھ رہا تھا کہ آپ کی رفاقت میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری اور جبلِ نور پر آپ کے چڑھنے کا انداز یاد آیا اور اس یاد نے آپ کو فون کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ جائے نماز ہی سے آپ کو

فون کر رہا ہوں، اس موقع پر جانبین پر کچھ رقّت کی کیفیت بھی طاری ہوگئی، اور ہر ایک نے دوسرے سے دعا کی درخواست پر بات ختم کردی۔

واضح رہے کہ ماہِ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو یہ یادگار سفر ہوا تھا، اور اس کے بعد تادمِ تحریر تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران مولانا سے صرف دو مختصر ملاقاتیں ہوچکی ہیں، اور چند سال قبل ایک مرتبہ فون پر بھی رابطہ ہوا تھا، اس کے بعد نہ تو آپس میں کوئی مستقل رابطہ تھا، نہ ہی میرے اس مضمون کی مولانا کو کوئی خبر تھی، اس کے باوجود اچانک رابطہ کرنے کو بشارتِ غیبی اور فالِ نیک کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو ہر پڑھنے والے کے لیے مفید اور لکھنے والے کے لیے دارَین کی کامیابی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا ذریعہ بنادے۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرقد کے سامنے

مواجہہ شریف پر حاضری کے بعد تقریباً ایک ہاتھ کے بقدر داہنی طرف کو کھسک کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دبی ہوئی آواز میں سلام پیش کرنے کی کوشش کی، اس موقع پر یہ تصور قائم رہا کہ یہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق اس کے آغاز کے ساتھ ہی کی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر ابتداء ہی سے لبیک کہا تھا، اور جب مسلمانوں پر مکہ مکرمہ کی زمین اتنی تنگ کردی گئی کہ اپنے دین پر قائم رہنا اُن کے لیے دشوار ہوگیا اور وہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ہجرت کرنے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ امتیاز رہا کہ جب اُنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی، آپؐ نے فرمایا: ”لا تعجل لعلّ الله أن يجعل لك صاحبًا“ یعنی آپ اکیلے ہجرت کرنے کی جلدی نہ

کیجئے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی رفیقِ سفر بھی عنایت فرمادیں۔

(البدایۃ والنھایۃ، ج:۲،ص:۵۶۰،ط:دارالفکر بیروت)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ وہ عظیم الشان رفیقِ سفر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہوں گے، چنانچہ اس وقت رُک گئے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ہجرت کرنے کی سعادت حاصل کرلی، اور تین دن تک ''غارِ ثور'' میں بھی ساتھ رہے، جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طرح فرمایا ہے:

''إِلاَّ تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْهُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِه لاَ تَحْزَنْ إِنَّ اللهَ مَعَنَا'' (التوبة:۴۰)

''یعنی اگر تم ان کی (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی) مدد نہیں کروگے (تو کوئی پروا نہیں کیونکہ) اللہ نے تو اس وقت ان کی مدد کی جب کافروں نے اس حال میں ان کو (مکہ سے) نکالا تھا جب وہ دو آدمیوں میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ کچھ غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غارِ ثور کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی ہونے کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جاں نثار خادم ہونے کا شرف بھی حاصل کرلیا، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آرام وراحت کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا، غارِ ثور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت گزاری سے متعلق اصحابِ سِیر نے جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ نے ''تفسیر عثمانی'' میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

''یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری مجوّف چٹان ہے، جس میں داخل ہونے کا

صرف ایک راستہ تھا وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا، صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا، اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر اُسے صاف کیا، سب سوراخ کپڑے سے بند کیے کہ کوئی کیڑا کانٹا گزند نہ پہنچا سکے، ایک سوراخ باقی تھا، اُس میں اپنا پاؤں اَڑا دیا، سب انتظام کر کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندر تشریف لانے کو کہا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صدیق کے زانو پر سر مبارک رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کا پاؤں ڈس لیا، مگر صدیق رضی اللہ عنہ پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے، مبادا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی استراحت میں خلل پڑے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعابِ مبارک صدیق رضی اللہ عنہ کے پاؤں کو لگا دیا، جس سے فوراً شفا ہو گئی۔

(تفسیر عثمانی، سورۃ التوبۃ)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قربانیوں اور اخلاص کا احاطہ کرنا تو بہت مشکل ہے، البتہ مندرجہ ذیل ایک واقعہ جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے، نمونہ کے طور پر درج کیا جا رہا ہے، جس سے ان کے اخلاص کا ایک حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (غزوۂ تبوک کے موقع پر) ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ کرنے کا حکم دے دیا اور اتفاق سے اُس وقت میرے پاس کچھ مال موجود تھا، میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ آج میں ابو بکر رضی اللہ عنہ سے (اس کارِ خیر میں) سبقت کروں گا اگر یہ ممکن ہو سکا، پس میں نے اپنے پورے مال میں سے آدھا مال لا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ اپنے گھر والوں کے لیے کتنا باقی رکھا؟ میں نے کہا جتنا لایا ہوں اتنا ہی ان کے لیے بھی چھوڑا ہے، اور (اتنے میں) ابو بکر رضی اللہ عنہ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سارا ہی لے کر حاضر ہوئے، پس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اے ابو بکر!

اپنے گھر والوں کے لیے کتنا باقی رکھا؟ صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ان کے لیے میں نے اللہ اور اس کے رسول کو باقی رکھا ہے، (یعنی اللہ و رسول کی رضامندی ان کے لیے کافی ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کبھی بھی کسی کارِ خیر میں سبقت نہیں کرسکتا۔''

(ترمذی شریف، ج:۲،ص:۲۰۸، ط: قدیمی کتب خانہ)

مذکورہ بالا روایت کا مفہوم علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ''بانگِ درا'' میں ''صدیق رضی اللہ عنہ'' کا عنوان لگا کر اپنے مخصوص اور مؤثر انداز میں ایک قصیدے کے اندر بیان کیا ہے، روایتِ بالا کے اندر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آخری جملہ کے مفہوم کو علامہ نے اپنے قصیدے کے آخری شعر میں جس انداز پر ذکر کیا ہے وہ شعر ایسا ہے کہ احقر جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی محبت، وفاداری، غارِ ثور میں رفاقت اور پھر آخری آرام گاہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوار میں جگہ پانے کی سعادت کا تصور کرتا ہے تو وہ شعر ضرور یاد آتا ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اسلامی زندگی پر اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے آغاز ہی سے وہ شروع ہوتی ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تقریباً ۲۳ سال تک مسلسل آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیرِ سایہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے، اس دوران صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہر ہر نیکی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے، اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوجاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت سنبھالنے کے لیے تقدیرِ خداوندی ان کو

مزید دو سال تین مہینے کی مہلت دے دیتی ہے، اور جیسے ہی صدیق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی ۶۳ رسال تک پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمرِ مبارک کے مطابق ہوجاتی ہے تو وہ خلافت کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نامزد کرتے ہوئے اپنی جان کو مولائے کریم کے سپرد کردیتے ہیں، اور تقدیرِ خداوندی آخری آرام گاہ کے طور پر ان کو جوارِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جگہ عطا کرتی ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی پر غور کرنے والوں کو وہ حدیثِ نبوی بھی خود بخود یاد آتی ہے جس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو جنت میں داخل ہونے کے لیے اس کے آٹھوں دروازوں سے بلائے جانے کی بشارت سنائی گئی ہے۔

(بخاری شریف، ج:۱،ص:۵۱۷، ط: قدیمی کتب خانہ)

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مرقد کے سامنے

آستانۂ صدیقی پر حاضری کے بعد پھر ایک ہاتھ کے بقدر داہنی طرف کھسک کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پست آواز اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ سلام پیش کرنے کی کوشش کی، اس موقع پر یہ تصور قائم رہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ ذیل خصوصی دُعا فرمائی تھی:

”أَللّٰهُم أعِزَّ الإسلام بأحبِّ هذين الرجلين إليك بأبي جهل أو بعمر بن الخطاب“

یعنی ”اے اللہ! اسلام کو قوت پہنچا ابوجہل اور عمر بن الخطاب میں سے جو شخص آپ کے نزدیک زیادہ محبوب ہو اس کے ذریعہ۔“

(ترمذی شریف، ج:۲،ص:۲۰۹، ط: قدیمی کتب خانہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی مذکورہ دُعا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں قبول کر کے یہ واضح فرما دیا کہ میرے نزدیک ان دونوں میں سے محبوب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں، اس خصوصی دُعا کے بعد صرف یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی دولت سے نوازا، بلکہ اسلام کو ان کے ذریعہ تقویت بھی پہنچائی۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مازلنا أعزّةً منذ أسلم عمر'' یعنی ''جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا ہم برابر طاقتور اور باعزت رہے۔'' (بخاری شریف، ج:۱،ص:۵۲۰، ط: قدیمی کتب خانہ)

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام دین کے لیے قوت بنا، اور ان کی ہجرت اسلام کے لیے کامیابی اور مدد کا ذریعہ بنی، اور ان کی خلافت رحمت ثابت ہوئی، اللہ کی قسم! ہم خانہ کعبہ کے پاس اعلانیہ طور پر نماز پڑھنے پر قادر نہیں تھے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، اور جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو مشرکین کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ہم علانیہ طور پر خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے لگے۔'' (کنز العمال، ج:۶،ص:۲۶۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بے شک اللہ نے عمر کی زبان پر اور ان کے دل میں حق کو جاری کر دیا ہے۔''

آگے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی ایسا اہم معاملہ سامنے آتا کہ لوگ اس میں اپنی آراء ظاہر کر دیتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے رائے ظاہر کر دیتے تو قرآن اس رائے کے مطابق نازل ہوتا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دے چکے ہوتے۔ (ترمذی شریف، ج:۲،ص:۲۰۹، ط: قدیمی کتب خانہ)

اور بخاری و مسلم کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''تین احکام میں اللہ کے منشے کے مطابق میری رائے نکلی: مقام ابراہیم، حجاب اور بدر کے قیدیوں سے متعلق۔''

(متفق علیہ بحوالہ مشکوۃ المصابیح،ص:۵۵۸،ط: قدیمی کتب خانہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اہلِ باطل پر ہمیشہ ان کا رعب و دبدبہ قائم رہتا تھا، اور ان کے مقابلہ کے لیے اہلِ باطل تیار نہیں ہو سکتے تھے، اور اگر کبھی مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ بھی ہو جاتے تو شکست ہی ان کی مقدّر بن جاتی، عام اہلِ باطل کو تو چھوڑیئے! شر و فساد کا سرغنہ اور تمام برائیوں کی بنیاد اور کفر و شرک کا سپہ سالار ابلیس لعین بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خوف سے لرزہ براندام ہو کر راستہ بدل لیتا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''والذی نفسي بیده مالقیكَ الشیطان قطُّ سالكاً فجًا إلا سلك فجًّا غیرَ فجِّك''

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! شیطان جب بھی کسی گلی میں چلتا ہوا آپ کا سامنا کرتا ہے تو (آپ کے رعب سے) اس گلی کو چھوڑ کر دوسری گلی سے چلنے کو اختیار کرتا ہے۔'' (بخاری شریف، ج:۱،ص:۴۶۵)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عدل و انصاف کی وہ مثالیں قائم کی ہیں جو تا روزِ قیامت آنے والے تمام اربابِ اقتدار کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں، کاش! مسلمانوں کے حکمران بلکہ ہر وہ مسلمان جس کو ادنیٰ سا اقتدار بھی حاصل ہو، چاہے کسی محکمہ کا ہو یا کسی ادارے کا، ادارہ بھی چاہے دینی ہو یا دنیوی! یہ تمام

حضرات اگر فاروقِ اعظمؓ کے عدل و انصاف کے واقعات اس نیت سے پڑھ لیتے کہ ہمیں ان کے طریقوں کو اپنانا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان ''علیکم بسنّتِي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين۔'' یعنی ''لازم پکڑو میرا طریقہ اور راہِ راست پر چلنے والے راہِ حق پانے والے میرے خلفاء کا طریقہ۔'' (ابو داؤد شریف، ج:۲، ص:۲۸۷) کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنتوں کو بھی مضبوطی سے پکڑنا ہے تو وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے اکثر مسائل خود بخود حل ہو جاتے، اور مسلمانوں کا ماحول جس طرح آج کل نظر آرہا ہے اس سے بالکل مختلف ہوتا۔

اس مختصر مضمون میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف اور زہد و قناعت کے بے شمار واقعات میں سے نمونہ کے طور پر صرف تین واقعات قلمبند کیے جارہے ہیں:

پہلا واقعہ

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اسلمؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک رات حسبِ معمول حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت فرمارہے تھے، اچانک ایک عورت کو دیکھا کہ اس نے اپنے گھر میں پانی سے بھری ہوئی ہانڈی آگ پر چڑھائی ہوئی ہے اور آس پاس چھوٹے بچے ہیں جو رو رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریب آکر پوچھا: اے اللہ کی بندی! یہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا: بھوک سے! فرمایا: اس ہانڈی میں کیا ہے؟ کہا: اس میں پانی ہے، البتہ اِن بچّوں کے ذہنوں میں' میں یہ ڈالنے کی کوشش کررہی ہوں کہ اس میں آٹا اور گھی ہے، تاکہ یہ خوشی خوشی میں سو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر رونے لگے، پھر دار الصدقہ جہاں صدقات کا

سامان تھا تشریف لے گئے اور ایک بوری میں آٹا، گھی، چربی، کھجور، کپڑے، اور کچھ سکّے بھر دیئے، اور مجھ سے (اسلم سے) فرمانے لگے کہ: یہ بوری میری پشت پر رکھیے، میں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! آپ مجھے اٹھانے دیجیے، میں اٹھاؤں گا، فرمایا: اے اسلم! کیسے نا سمجھ ہو! میں ہی اُٹھاؤں گا، اس لیے کہ قیامت میں مجھ ہی سے سوال ہوگا۔

بہر صورت! حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی وہ بوری اُٹھاتے ہوئے اس عورت کے گھر پہنچے اور خود ہی ہانڈی میں کچھ آٹا اور چربی اور کھجور ڈال کر ملاتے رہے اور آگ کو تازہ رکھنے کے لیے ہانڈی کے نیچے پھونکتے رہے، اور چونکہ آپ کی داڑھی کافی بڑی تھی، اس لیے دھواں داڑھی کے درمیان میں سے نکلتا رہا، یہاں تک کہ کھانا تیار کر دیا، پھر اپنے ہاتھوں سے اُن بچوں کو کھلایا، یہاں تک کہ شکم سیر ہو گئے، پھر (ان بچوں کو ہنسانے اور خوش کرنے کے لیے) درندہ کی نقل اُتارتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھنے اور چلنے لگے (میں تو اس کیفیت کو دیکھ کر حیران ہوا) البتہ ان سے کچھ پوچھنا میرے بس میں نہ تھا، وہ برابر ان بچوں کے ساتھ اسی طرح رہے، یہاں تک کہ وہ بچے بھی کھیلنے اور ہنسنے لگے، پھر مجھ سے فرمایا کہ: اے اسلم! جانتے ہو میں نے درندے کی نقل ان بچوں کے سامنے کیوں اتاری؟ میں نے کہا: نہیں، فرمایا: میں نے ان کو روتے ہوئے دیکھا تھا اور ایسی ہی حالت میں ان کو چھوڑ کر جانا مجھے پسند نہیں تھا، یہاں تک کہ میں نے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو میرا دل خوش ہوا۔'' (کنز العمال، ج:٦،ص:٢٨٩، مطبوعہ بیروت)

دوسرا واقعہ

''اسلمؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت کرنے کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ تھا، ہمیں ایک خیمہ نظر آیا جس میں سے ایک خاتون کے رونے کی آواز آ رہی تھی جو دردِ زہ میں مبتلا تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے جب صورتحال معلوم کی تو معلوم ہوا کہ اس غریب خاتون کے پاس (کھانے پینے اور ولادت کے وقت درکار ضروری سامان میں سے) کچھ بھی نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور تیز قدموں کے ساتھ اپنے گھر تشریف لے جا کر اپنی زوجہ محترمہ امّ کلثوم بنت علی بن ابی طالب سے کہنے لگے کہ: کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ اللہ آپ کو اجر و ثواب عطا فرمادے؟ اور ان کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا، انہوں نے کہا: کیوں نہیں؟ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی پشت پر آٹا اور چربی اور ام کلثومؓ نے ولادت کے لیے درکار ضروری سامان اٹھایا اور دونوں خیمہ کے پاس پہنچے، امّ کلثوم تو اس خاتون کے تعاون کے لیے اندر تشریف لے گئیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے شوہر کے ساتھ باہر تشریف فرما ہو کر ان کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہو گئے، وہ شخص یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ امیر المؤمنین ہیں، تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہوا، ام کلثومؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پکارا کہ اے امیر المؤمنین! اپنے ساتھی کو بچے کی مبارکباد دیجیے، امیر المؤمنین کا لفظ سن کر وہ شخص چونک اٹھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے معذرت کرنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کوئی بات نہیں، اس کے بعد ان کی ضروریات کا خرچہ بھی دے دیا۔''

(البدایہ والنہایہ، ج:۵،ص:۲۱۶)

تیسرا واقعہ

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت جب کہ وہ امیر المؤمنین تھے، دیکھا کہ اپنے کندھوں کے درمیان اپنے کرتے پر تین پیوند اس طرح لگا رکھے تھے کہ بعض دوسرے بعض پر چڑھے ہوئے تھے۔''

(کنز العمال، ج:۶،ص:۲۷۹)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زندگی اور واقعات پر غور کرنے کے بعد ان کی ایسی خصوصیت بھی سامنے آتی ہے جو ان کے بعد سے آج تک نہ تو کسی کو اُس پیمانے

پرنصیب ہوئی ہے جس پیمانے پر ان کو حاصل تھی اور نہ ہی آج کے بعد سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کسی کو حاصل ہو سکے گی ،اور وہ خصوصیت ہے: ''بے پناہ شجاعت کے ساتھ ساتھ بے انتہاء تواضع'' عام طور پر یہ نظر آتا ہے کہ اگر کسی کے اندر شجاعت کی صفت موجود ہو تو پھر تواضع کی صفت موجود نہیں ہوتی یا کافی کمزور ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر تواضع کی صفت موجود ہوتی ہے تو پھر شجاعت نظر نہیں آتی، لیکن حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شجاعت کا تو وہ مقام ہے کہ متکبرین کا سرغنہ ابلیس لعین جس نے فرعون کو ''أَنَا رَبُّكُمُ الأَعْلَىٰ'' کہنے کی تعلیم دی وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شجاعت و دبدبہ سے مرعوب ہو کر راستہ بدل لیتا، اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے تو علی الاعلان خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور اِس امت کا فرعون (ابوجہل) اور دیگر سردارانِ قریش ان کو اس علانیہ عبادت سے نہ روک سکے، اور ابن عساکرؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ:

''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنی تلوار و کمان کو لے کر بیت اللہ کے پاس آئے جہاں سردارانِ قریش بیٹھے ہوئے تھے، بیت اللہ کا پورا طواف کیا، پھر مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا فرمائی، پھر مشرکین کی جماعت میں سے جو لوگ وہاں پر موجود تھے ایک ایک کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے یہ چہرے ذلیل ہو جائیں، جس کا ارادہ ہو کہ اس کی ماں اسے ناپید کر دے اور اس کی اولاد یتیم ہو جائے اور اس کی بیوی رانڈ ہو جائے وہ (مجھ کو ہجرت سے روکنے کے لیے) اس وادی کے پیچھے مل لے (لیکن ہوا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب کی وجہ سے) ایک بھی ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نہ جا سکا۔''

(حیاۃ الصحابہؓ، ج: ۳، ص: ۵۸۴)

شجاعت کے مذکورہ بالا مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تواضع کی یہ حالت تھی کہ ایک وسیع دولت اسلامیہ کے امیر المؤمنین ہونے کے باوجود پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، اور بے سہارا خاندانوں کی خبر گیری کے لیے اپنی پشت پر ضروری سامان اُٹھا کر لے جانے سے دریغ نہیں فرماتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ شجاعت و تواضع کا اس حد تک امتزاج حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شجاعت و تواضع، عدل و انصاف، زہد و قناعت، انتظامی امور میں اعلیٰ صلاحیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کے لیے ایک خصوصی دُعا (جس کا تذکرہ ہو چکا ہے) کی برکت سے ان کے دورِ خلافت میں اسلام کو خوب قوت و ترقی حاصل ہوئی اور زیادہ پھیلنے کا موقع ملا، چنانچہ آپ ہی کے زمانہ میں ایران، شام، عراق، قدس، مدائن، مصر وغیرہ سب فتح ہوئے، اور ملّتِ اسلامیہ کا پوری دنیا پر ایک رعب قائم ہو گیا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی آخری تمنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں، پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اور پھر اپنے دورِ خلافت میں دینِ متین کے لیے بے شمار قربانیاں پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی آخری ایک ایسی تمنا عرض کر دی جس کے تین اجزاء تھے:

پہلا جزء: ''اللہ کی راہ میں شہادت۔''

دوسرا جزء: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ کے اندر موت۔''

تیسرا جزء: ''کسی کلمہ گو کے ہاتھ سے نہیں بلکہ غیر مسلم کے ہاتھ سے شہادت۔''

شروع کے دو اجزاء سے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل دعا نقل کی ہے: ''أللّٰهم ارزقني شهادةً في سبيلك واجعل موتي في بلد رسولك'' یعنی ''اے اللہ! مجھے اپنے راستہ میں شہادت عطا فرما، اور اپنے رسول کے شہر میں وفات نصیب فرما۔''

(بخاری شریف، ج:۱، ص: ۲۵۳)

اور تیسرے جزء سے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ کے واسطے سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی یہ دعا نقل کی ہے: ''أللّٰهُم لا تجعل قتلي بيَد رجل يصلي لك سجدة واحدة يحاجّني بها عندك يوم القيامة'' یعنی ''اے اللہ! کسی ایسے شخص کے ہاتھ میرا قتل مقدّر نہ فرما جس نے آپ کے آگے کوئی ایک سجدہ بھی کیا ہو، جس کے سہارے وہ قیامت کے دن آپ کے دربار میں میرے ساتھ جھگڑا کر سکتا ہو۔''

(موطّا امام مالک رحمہ اللہ، ص: ۶۷۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کی اس آخری تمنا میں جن تین چیزوں کی دعا مانگی تھی ان کا جمع ہونا ظاہری اسباب کے اعتبار سے غیر متوقع تھا، اس لیے کہ آپ کے دورِ خلافت کے آخری دنوں میں حق و باطل کے معرکے تو مدینہ منورہ سے ہزاروں میل دور برپا تھے، اور ان ہی دور افتادہ مقامات میں شہادت کی توقع کی جا سکتی تھی اور مدینہ منورہ چونکہ مسلمانوں کا دارالخلافہ تھا اور اس میں مکمل طور پر امن و امان کی فضا قائم تھی تو وہاں پر موت کی توقع تو کی جا سکتی تھی، لیکن کسی کافر کے ہاتھ سے امیر المؤمنین کی شہادت کا ماحول موجود نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص

بندے کی مخلصانہ دعا کو قبول فرماتے ہوئے اُن تینوں چیزوں کو جمع فرمادیا، اور وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ میں فیروز نام کا ایک مجوسی غلام تھا جس کی کنیت ابولؤلؤتھی، اس نے بروز چہارشنبہ ۲۶/ذوالحجہ ۲۳ھ کو ایسے وقت میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر خنجر سے پے درپے کئی وار کر کے شدید زخمی کردیا جب وہ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، ان ہی زخموں کی وجہ سے تین دن کے بعد مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اندر ہی شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور یکم محرم ۲۴ھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن ہونے کی سعادت سے بھی نوازے گئے۔ مشہور وراجح قول کے مطابق ان کی مدّتِ خلافت دس سال چھ مہینے چار دن رہی۔ رضي الله تعالٰی عنه و أرضاه

مسجد نبوی کی اذانیں

مدینہ منورہ کی اس پہلی حاضری کے موقع پر جب مسجدِ نبوی کے احاطہ سے پُراثر آواز میں اذان کی تکبیریں بلند ہوئیں تو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ دل پر پڑے ہوئے غفلت کے پردوں کو ہٹایا جارہا ہے اور ایمانی کیفیت میں اضافے کا سامان مہیّا کیا جارہا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مندرجہ ذیل فرمان کے مطابق شیطان لعین کو بھاگنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”إذا نُودِيَ للصلوة أدبر الشيطن له ضُراطٌ حتی لایسمع التأذین فاذا قُضِي النداء أقبل حتی إذا ثُوّب بالصلوة أدبرَ حتی إذا قُضِي التثويب أقبل حتی يخطر بین المرء ونفسه يقول اذكر كذا اذكر كذا لما لم يكن يذكر حتی يظل الرجل لايدري كم صلیّ“

(بخاری شریف، ج:۱، ص:۸۵)

یعنی ’’جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان آواز کے ساتھ گوز خارج کرتا ہوا پشت پھیر کر بھاگتا ہے، تاکہ اذان نہ سنے، پھر جب اذان پوری ہو جاتی ہے تو واپس آجاتا ہے، یہاں تک کہ جب اقامت شروع ہوتی ہے پھر پیٹھ دے کر بھاگتا ہے، اور جب اقامت پوری ہو جاتی ہے پھر واپس آجاتا ہے، یہاں تک کہ نمازی اور اس کے نفس کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کرو، فلاں بات یاد کرو جو باتیں نمازی کو یاد بھی نہیں تھیں، یہاں تک کہ نمازی اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعت نماز پڑھی ہے۔‘‘

جب مسجدِ نبوی کے قابلِ صد احترام مؤذن صاحب نے اذان دیتے ہوئے ’’أشهد أن محمدا رسول الله‘‘ کی آواز اپنے مخصوص انداز و لہجے کے ساتھ بلند کی تو اس کے اثر و کشش سے ذہن سوچنے لگا کہ جب پندرہویں صدی ہجری میں مسجدِ نبوی کی اذان اتنی با اثر ہے تو ’’اذانِ بلالی‘‘ کی کیا کیفیت رہی ہوگی؟ ایسے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن وصحابی حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ (متوفّٰی: ۲۰ھ) سے محبت رکھنے والے اور ان کی زندگی سے ایک حد تک واقفیت رکھنے والے شخص کے ذہن میں ان کا وہ تاریخی واقعہ گھومنے لگتا ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پیش آیا تھا جس زمانہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے سرزمینِ شام کے اندر ’’داریا‘‘ قصبہ میں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

امام نورالدین علی بن احمد السمہودی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی: ۹۲۲ھ) نے اپنی کتاب ’’خلاصة الوفاء بأخبار دار المصطفٰی‘‘ میں ابن عساکر کے حوالہ سے سندِ جیّد کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اس زمانہ کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے جب وہ دمشق کے مضافات میں واقع ’’داریا‘‘ قصبہ میں مقیم تھے، اس قصہ کا خلاصہ اردو

زبان میں پیش کیا جا رہا ہے:

''حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی، آپ فرمارہے ہیں: اے بلال! یہ کیا زیادتی ہے؟ اے بلال! کیا آپ کے لیے میری زیارت کرنے کا وقت نہیں آیا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حزن و ملال کی حالت میں بیدار ہوتے ہی اپنی سواری پر سوار ہو کر مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے، مدینہ منورہ پہنچ کر روضۂ اقدس پر رونے دھونے کے ساتھ حاضری دی، اس دوران حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما ان کے پاس تشریف لائے جنہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے سینے سے لگا کر پیار کیا، ان دونوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہماری تمنّا ہے کہ آپ مسجدِ نبوی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ایسی اذان دیں جس طرح آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں دیا کرتے تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آلِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس خواہش کو پورا کیے بغیر نہ رہ سکے اور اذان دینے کے لیے آمادہ ہو گئے اور جیسے ہی مدینہ کی فضاء میں بلالی آواز کے ساتھ ''الله أكبر الله أكبر'' کی صدا بلند ہوئی تو شہر میں کہرام مچ گیا، اور جب ''أشهد أن لا إله إلا الله'' کی آواز بلند ہوئی تو کہرام میں اضافہ ہو گیا اور جب ''أشهد أن محمدا رسول الله'' کا جملہ بلالی لہجہ کے ساتھ مدینہ منورہ کی فضاء میں گونجنے لگا تو پردہ نشین خواتین تک بھی باہر نکل آئیں اور کہنے لگیں کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوبارہ دنیا میں تشریف لائے؟ رونے والوں اور رونے والیوں کی اتنی بڑی تعداد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سانحہ وفات والے دن کے علاوہ مدینہ میں کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔
ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر خود بھی اتنا اثر ہوا کہ اذان مکمل نہ کر سکے۔'' (خلاصۃ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ، ص: ۹۸، مطبوعہ دمشق)

مسجدِ نبوی کی نمازیں اور امام حرم سے پہلی ملاقات

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری میں اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صلوةٌ في مسجدي

هٰذاخير من ألف صلوةٍ فيما سواه إلا المسجد الحرام ''یعنی: ''میری اس مسجد میں ایک نماز مسجدِ حرام کے علاوہ دیگر مسجدوں کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔'' (بخاری شریف، ج:۱،ص:۱۵۹)

ہمیں حرمین شریفین کی اس پہلی زیارت کے لیے جامعۃ الملک سعود کی طرف سے مختصر وقت کے لیے اجازت ملی تھی، اس لیے مسجدِ نبوی میں ظاہری گنتی کے اعتبار سے تو چند ہی نمازیں ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، لیکن مندرجہ بالا صحیح حدیث کی روشنی میں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ان کی معنوی تعداد بڑھ گئی ہوگی، اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

احقر نے حجازِ مقدس کی حاضری سے پہلے امام مسجدِ نبوی شیخ علی عبد الرحمن الحذیفی زید مجدہم کی باا ثر و پرکیف تلاوت ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند میں سنی تھی، جس سے غائبانہ طور پر ان سے ایک قلبی اور گہری محبت پیدا ہوگئی تھی، مسجدِ نبوی کی اس پہلی حاضری کے موقع پر دل میں یہ تمنا تھی کہ شیخ حذیفی کی تلاوت براہِ راست سننے اور ان کی زیارت کرنے کا موقع ملے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا اس طرح پوری کردی کہ شبِ جمعہ کو عشاء کی نماز کے وقت محافظین کے درمیان ایک نورانی چہرہ والے میانہ قد شخص جن کے چہرے پر معصومیت وسادگی کے آثار نمایاں تھے' تشریف لائے اور نماز پڑھانے کے لیے مسجدِ نبوی کی محراب کی طرف آگے بڑھے، میں محراب کے سامنے غالباً چوتھی صف میں تھا، نماز شروع ہوئی اور ثناء کے بعد جیسے ہی امام صاحب نے سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت پڑھی' احقر کو یقین ہو گیا کہ یہی تو امام الحرم شیخ علی عبدالرحمن الحذیفی ہیں، شیخ نے نماز کی دونوں جہری رکعتوں میں سورۂ احزاب کا آخری حصہ پڑھا۔

غور کیا جائے! سالوں سال کی تمناؤں کے بعد مسجدِ نبوی کی پہلی زیارت حاصل ہورہی ہو اور اسی فضاء میں فرض نماز باجماعت ادا کی جارہی ہو جس میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان شریک ہوں، اُن مسلمانوں میں عرب وعجم، مسافر ومقیم، بوڑھے و جوان، مرد وخواتین اور امیر وفقیر سب کی شمولیت ہو، تھوڑی دیر پہلے اسی فضاء سے ایک ایسی اذان کی آواز بلند ہوچکی ہو جس نے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو، نماز میں شیخ حذیفی کی تلاوت ہورہی ہو اور وہ بھی سورۂ احزاب کے اس حصہ کی جس میں نافرمان لوگوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہو: ''یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَا أَطَعْنَا اللهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُوْلَا'' یعنی: ''جس دن ان کے چہرے (جہنم کی) آگ میں اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ: اے کاش! ہم اللہ کی فرمانبرداری کرتے اور اس کے رسول کا حکم مانتے۔'' (الاحزاب:٦٦) اور ذرا آگے فرماں برداروں سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہو: ''وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَه فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْمًا'' یعنی ''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا تو یقیناً وہ بڑی کامیابی پائے گا۔'' (الاحزاب:۷۱)

زندگی میں پہلی بار حاضری دینے والا شخص جب مسجدِ نبوی کے احاطہ اور روضۂ اقدس کے جوار میں فرض نماز کے اندر مذکورہ بالا جیسی آیتوں کی تلاوت شیخ حذیفی کی زبان سے سماعت کرے گا تو اس کا دل جتنا بھی غفلتوں میں ڈوبا ہوا ہوگا پھر بھی خوف ورجاء کی ملی جلی کیفیت سے لرزے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کا بدن جتنا بھی گناہ آلود ہوگا وہ بھی کانپے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کی آنکھیں بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

سلام پھیرنے کے بعد شیخ حذیفی نے حسبِ معمول مڑ کر اپنا رخ مقتدیوں کی

طرف کر دیا اور اذکارِ مسنونہ میں مشغول ہو گئے، مجھے چونکہ محراب کے بالکل سامنے چند ہی صفیں چھوڑ کر جگہ ملی تھی، اس لیے ان کے بابرکت اور نورانی چہرہ کی زیارت کا ایک اچھا موقع تھا، لہٰذا اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ذرا فاصلہ سے ان کی زیارت کی، اور اگلے دن بروز جمعہ فجر کی نماز کے بعد جب وہ مسجدِ نبوی سے واپس قیام گاہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں ان سے مختصر ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔

روضۂ جنت میں حاضری

مدینہ منورہ کے اس والہانہ سفر کے دوران روضۂ جنت میں حاضری کا موقع بھی ربّ کریم نے عنایت فرمایا، مسجد نبوی میں منبر سے بائیں طرف تقریباً پچاس ہاتھ کے فاصلے پر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہ t کا حجرہ مبارکہ ہے، جہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام فرما رہے ہیں، منبر اور حجرے کے درمیان والے حصہ سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''مابين بيتي ومنبري روضةٌ من رياض الجنة'' یعنی: ''جو جگہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ہے وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔'' (بخاری شریف، ج:۱، ص:۱۵۹)

اس حدیث کی تشریح میں علماء کرام کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ لفظ اپنی حقیقت پر محمول ہے اور مسجدِ نبوی کا مذکورہ بالا حصہ بعینہٖ قیامت کے دن جنت میں منتقل کیا جائے گا، اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (متوفّٰی: ۱۳۹۲ھ) کے حوالہ سے ان کے خصوصی شاگرد اور ہمارے محترم اُستاذ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم العالیہ[1] استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند نے ''ایضاح البخاری، ج:۶، ص:۸۱:''

---

[1]) ۲۳ شعبان ۱۴۳۸ھ کو حضرت الاستاذ کا وصال ہوگیا۔ رحمہ اللہ ۱۲

میں ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے کہ روضۂ جنت میں داخل ہو کر عبادت کرنے والے کو نیک فالی کے طور پر یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ ان شاء اللہ! وہ جنت سے محروم نہیں ہوگا، اس لیے کہ جنت میں جانے کے بعد کسی کو پھر اس سے نکال کر محروم نہیں کر دیا جاتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کے آخری دن کا ایک منظر

روضۂ جنت میں حاضری کا موقع ہو یا غائبانہ طور پر اس کا اور حجرۂ مبارکہ و محراب و منبر کا تذکرہ ہو، احقر کو بخاری شریف کی وہ روایتیں ضرور یاد آتی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مرض الموت اور زندگی کے آخری دن کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے، ان روایات کا مفہوم و خلاصہ یہ ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے مرض الموت کے دوران بھی جب ذرا سی طاقت رہتی مسجد میں تشریف لا کر نماز پڑھا دیتے، جب ضعف کافی بڑھ گیا تو وفات والے دن سے پہلے مسلسل تین دن (جمعہ، ہفتہ، اتوار) تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد میں تشریف نہ لا سکے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم سے نمازیں پڑھاتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بیماری میں اضافے اور مسجد میں عدمِ تشریف آوری کی وجہ سے کافی غمگین تھے، چوتھے دن بروز پیر ایک ایسے وقت میں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فجر کی نماز میں صف باندھے کھڑے تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اچانک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا پردہ ہٹایا اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا منظر دیکھ کر خوشی اور اطمینان کی وجہ سے مسکرانے اور پھر ہنسنے لگے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا چہرۂ مبارک اتنا منوّر و پاکیزہ اور پر رونق معلوم ہو رہا تھا جیسے قرآن کریم کا ورق ہو، اور چونکہ کئی نمازوں کے

بعد ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور کی زیارت نصیب ہو رہی تھی، اس لیے قریب تھا کہ فرطِ مسرت سے ہمارے اندر ایک ایسی اضطرابی کیفیت پیدا ہو جائے جو نماز میں نقصان کا باعث بنے، صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر کہ شاید آپ تشریف لا رہے ہیں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ سے بتا دیا کہ تم اپنی نماز پوری کر لو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پردہ جو ہٹایا تھا واپس ڈال دیا، اس کے بعد ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت میسر نہ ہو سکی اور اُسی دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی۔''

(بخاری شریف، ج:۱، ص: ۹۳ - ۹۴ نیز ج: ۲، ص: ۶۴۰)

راقم نے بخاری شریف جلد اوّل حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خان صاحب قدس سرہٗ (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) (متوفّٰی: ۱۴۳۱ھ) اور جلد ثانی حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) سے تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ - ۱۴۰۲ھ کو دارالعلوم دیوبند میں پڑھی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الموت اور زندگی کے آخری دن کے مذکورہ بالا منظر سے متعلق حدیثیں چونکہ بخاری شریف جلد اول میں ''بابُ أهلُ العلم والفضل أحق بالامامة'' کے تحت بھی آ گئی ہیں اور جلد ثانی میں ''بابُ مرض النبي صلى الله عليه وسلم ووفاته'' کے تحت بھی! اس لیے دونوں اکابرین نے اپنے اپنے انداز کے مطابق ان پر گفتگو فرمائی تھی۔

حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خاں صاحب قدّس اللہ سرّہٗ پر تو ایسے مضمون کو بیان کرتے ہوئے اس طرح رقت طاری ہو جاتی تھی کہ زیادہ تفصیل سے بات کرنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا، لیکن ان کی رقتِ قلبی اور اخلاص کی برکت سے طلبہ کو پھر بھی بہت کچھ مل جاتا، اور حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

دامت برکاتہم نے اپنے خداداد ملکۂ افہام و تفہیم اور حبّ نبوی کی بدولت اس مضمون کو ایک ایسے انداز میں بیان فرمایا تھا کہ طلبہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ شاید ہم بھی پیر کے دن کی صبح کا یہ مبارک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور پھر اُسی دن کے آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فداہ اُبی و اُمّی کے وصال کا مشکل ترین مرحلہ بھی ہمارے سامنے وقوع پذیر ہوتا ہے: ''اللّٰھم صل علٰی محمدنِ النبی الأمي وعلیٰ آله وسلِم تسلیما۔''

ستونہائے رحمت کی زیارت

روضۂ جنت میں سات ستون ہیں جن کو اسطواناتِ رحمت کہا جاتا ہے، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:

۱:......اسطوانۂ حنّانہ، ۲:......اسطوانۂ اُبولبابہؓ، ۳:......اسطوانۂ حرس،

۴:......اسطوانۂ وُفود، ۵:......اسطوانۂ سریر، ۶:......اسطوانۂ جبریلؑ،

۷:......اسطوانۂ عائشہؓ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان ستونہائے رحمت کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا اور ہر ایک ستون نے اپنی تاریخ یاد دلائی، اول الذکر دو ستونوں سے متعلق کچھ تفصیل درج کی جارہی ہے:

اسطوانۂ حنّانہ

اُسطوانہ حنّانہ اس جگہ پر بنایا ہوا ستون ہے جہاں کھجور کا ایک تنا تھا، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فراق پر زور زور سے رویا تھا، اس تنے سے متعلق صحیح البخاری ''کتاب الجمعۃ، ج:۱، ص:۱۲۵'' اور ''کتاب المناقب، ج:۱، ص:۵۰۶'' اور

سنن ترمذی ''ابواب الجمعۃ، ج:۱، ص:۱۱۳'' میں روایات موجود ہیں، اسی طرح امام عبداللہ بن عبدالرحمن الدارمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی: ۲۵۵ھ) نے سنن دارمی میں مقدمہ کے اندر ایک مستقل باب بعنوان ''باب ما أكرم اللهُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم بحَنين المنبر'' قائم کر کے گیارہ روایتیں ذکر کی ہیں، مذکورہ تمام روایات کا خلاصہ و مفہوم یہ ہے:

''مسجد نبوی میں منبر بننے سے پہلے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دیتے تھے تو کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے تھے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے منبر کا انتظام کر دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس منبر پر خطبہ دینے کے لیے تشریف لے گئے تو وہ تنا فراقِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا صدمہ برداشت نہ کر سکا، اور اس سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی کے رونے کی طرح آواز آنے لگی اور اتنا رویا گویا پھٹ جائے گا، اس کے رونے کی آواز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی سنتے رہے، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر سے نیچے اترے اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر سینے سے لگایا جس سے وہ اس بچے کی طرح جسے تھپکیاں دے کر خاموش کیا جاتا ہے ہچکیاں لیتے ہوئے خاموش ہو گیا، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر میں نے اس تنے کو اپنے سینے سے نہ لگایا ہوتا تو یہ اسی طرح قیامت تک روتا رہتا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دفنانے کا حکم دے دیا، چنانچہ اُسے دفنا دیا گیا۔''

راقم عرض کرتا ہے کہ اسطوانہ حنّانہ کی زیارت کرنے والوں کو مذکورہ واقعہ کا استحضار کرتے ہوئے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جب ایک غیر مکلف خشک تنا جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی اُس مخلوق سے ہو جس نے امانتِ خداوندی (شریعت کاملہ کی پابندی) کے بوجھ اُٹھانے سے ابتداء ہی سے معذرت کر لی ہو وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی محبت کرتا ہے کہ غمِ فراق میں بلک بلک کر رو رہا ہے تو اُس انسان کو جس نے

امانتِ خداوندی کے بوجھ اُٹھانے کے لیے شروع ہی سے آمادگی ظاہر کی ہو اور پھر ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ'' پڑھنے کا اظہار بھی کیا ہو اُسے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کتنی محبت کرنی چاہیے؟

اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرے اور اللہ کے فرمان ''أَطِيْعُوْا اللهَ وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ'' پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہر ہر حکم کی اطاعت و پیروی کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کرے۔

اسطوانہ حنّانہ کی زیارت کے وقت اس کے مذکورہ بالا واقعہ اور اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اگر زائر اپنی استقامت کے لیے لجاجت کے ساتھ دعا کرے گا اُمید ہے کہ ربّ کریم اس کی دعا کو قبولیت سے نوازے گا۔

اسطوانۂ ابولبابہؓ

اسطوانۂ ابولبابہؓ وہ ستون ہے جس کے ساتھ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے اظہارِ توبہ وندامت کے طور پر اپنے آپ کو باندھ لیا تھا، کیونکہ وہ غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہو سکے تھے، اور بالآخر اُن کی توبہ قبول ہوگئی تھی، اس ستون کی زیارت نے سورۂ توبہ آیت نمبر: ۱۰۲ یاد دلائی جس کے بارے میں علّامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ قول نقل کیا ہے کہ: ''یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی، جن کی کل تعداد چھ یا آٹھ یا دس تھی''، ان حضرات میں سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے نام پر تمام روایات متفق ہیں، باقی حضرات کی تعداد اور ناموں میں مختلف روایات ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ تبوک میں شرکت کے لیے اعلانِ عام فرمایا تھا، اور سب مسلمانوں کو چلنے کا حکم دیا تھا، البتہ کچھ ایسے مخلص مسلمان تھے جن کے پاس معقول عذر تھا، ان کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، کچھ منافقین تھے جنہوں نے جھوٹے اعذار پیش کر دیئے، اور شریک نہیں ہوئے، ان منافقین کے بارہ میں سورۂ توبہ میں سخت وعیدیں نازل ہوئیں، مسلمانوں میں کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو صرف وقتی سستی کی بنیاد پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلانِ عام پر تو عمل نہ کر سکے اور غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے، مگر بعد میں اخلاص کے ساتھ نادم و تائب ہو گئے اور منافقین کی طرح جھوٹے اعذار تلاش نہیں کیے، اور بالآخر اُن سب کی توبہ قبول ہوگئی، بلاعذر پیچھے رہنے والے ان حضرات کی بھی دو جماعتیں ہوگئی تھیں، ایک جماعت وہ تھی جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واپسی کے بعد فوراً اپنی ندامت و توبہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے آپ کو مسجدِ نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی اور ہمیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں کھولیں گے ہم اسی طرح بندھے ہوئے قیدی رہیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب ان کے اس عہد کا پتہ چلا تو فرمایا کہ: اللہ کی قسم! میں بھی ان کو اس وقت تک نہیں کھولوں گا جب تک اللہ تعالیٰ مجھے ان کے کھولنے کا حکم نہیں دے گا، اس پر سورۂ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

”وَآخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّآخَرَ سَيِّئاً عَسَى اللهُ أَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ“

(التوبة: ۱۰۲)

”اور کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا انہوں نے ملے جلے عمل کیے کچھ اچھے اور کچھ برے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے، بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے“۔

اس جماعت میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جب مذکورہ آیت اتری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی توبہ قبول ہونے کی خوشخبری سنائی اور صحابہؓ کو اُن کے کھولنے کا حکم دے دیا، تو حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب تک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی ہوکر مجھے اپنے دستِ مبارک سے نہیں کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ فجر کی نماز میں آپ تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا، حضرت ابولبابہؓ والی اس جماعت نے توبہ کرنے کا ایسا مخلصانہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمادی جس میں تا روزِ قیامت آنے والے ان تمام مسلمانوں کے لیے جن کے اعمال نیک و بد ملے جلے ہوں اور وہ اپنے گناہوں سے اخلاص کے ساتھ تائب ہوجائیں معافی اور مغفرت کی امید ہے۔

غزوۂ تبوک میں صرف سستی کی وجہ سے شرکت نہ کرنے والے مخلص مسلمانوں کی دوسری جماعت مندرجہ ذیل تین انصاری صحابہؓ پر مشتمل تھی:

۱:...... حضرت کعب بن مالکؓ

۲:...... حضرت مرارہ بن ربیعؓ

۳:...... حضرت ہلال بن امیہؓ

یہ حضرات اگرچہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ والی جماعت کی طرح طریقہ تو اختیار نہ کرسکے، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واپسی کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر صاف صاف اپنی سستی اور کوتاہی کا اعتراف کرلیا اور کوئی جھوٹا عذر پیش نہیں کیا، ہاں! یہ وضاحت ضرور کردی کہ یہ کوتاہی صرف سستی کی بنا پر ہوئی ہے، نفاق کی وجہ سے نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی سچائی کو تسلیم فرماتے ہوئے ان کی کوتاہی کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دیا کہ جب تک اللہ تعالیٰ ان کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں فرمائیں

گے تب تک ان سے سلام اور کلام کا مقاطعہ کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کے اعراض اور صحابۂ کرامؓ کے مقاطعۂ سلام وکلام کی انتہائی مصیبت پچاس دن تک جھیلنے کے بعد ان تینوں حضرات کی توبہ کو بھی ربّ کریم نے قبول فرما کر ان کے حق میں سورۂ توبہ کی مندرجہ ذیل آیت نازل فرمادی:

''وَعَلَى الثَّلاَثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا أَنْ لاَّ مَلْجَأَ مِنَ اللهِ إِلاَّ إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا إِنَّ اللهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ'' (التوبة:۱۱۸)

''اور ان تین شخصوں پر بھی (اللہ نے مہربانی کی) جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ جب زمین باوجود اس قدر وسیع ہونے کے ان پر تنگ ہوگئی، اور وہ خود بھی اپنی جانوں سے تنگ آگئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کی گرفت سے انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی، مگر یہ کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی تاکہ وہ توبہ کریں، بلاشبہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے''۔

آیت اترنے کے بعد نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ نے ان تینوں کو توبہ قبول ہونے کی خوشخبری سنا کر مبارکباد دی، اور آپ ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو مبارکباد دی: ''بشارت ہو تمہیں ایک ایسے مبارک دن کی جو تمہاری زندگی میں پیدائش سے لے کر آج تک سب سے زیادہ بہتر دن ہے۔'' اس واقعہ کی پوری تفصیل (صحیح البخاری، ج:۲، ص: ۶۳۴-۶۳۶) اور حدیث کی دیگر کتابوں میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے درج ہے۔

بہرکیف! روضۂ جنت میں اسطوانہ ابولبابہ کی زیارت حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ

اوران کے ساتھیوں کا مذکورہ واقعہ یاد دلاتی ہے، اور پھر اُن کی مخلصانہ توبہ کی قبولیت کے نتیجہ میں اُتری ہوئی سورۂ توبہ کی آیت نمبر: ۱۰۲ پر جب غور کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کے الفاظ کے عموم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارحم الراحمین نے صرف حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ والی جماعت کے حق میں نہیں بلکہ بعد میں آنے والے تائبین (چاہے وہ پندرہویں صدی ہجری کے پرفتن زمانہ کے تائبین کیوں نہ ہوں) کے حق میں بھی قبولیتِ توبہ کا وعدہ فرمایا ہے، اور پھر اسی مناسبت سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ والی جماعت کا مذکورہ واقعہ اوران کے حق میں اُتری ہوئی سورۂ توبہ کی آیت نمبر: ۱۱۸ خودبخود یادآتی ہے، اورایک ایسی کیفیت زائر کے اندر پیدا ہوجاتی ہے جس کا مفہوم شیخ فریدالدین عطارؒ نے مندرجۂ ذیل دوشعروں میں بیان کیا ہے:

بر درآمد بندۂ بگریختہ — آبروئے خود بعصیاں ریختہ
مغفرت دارد امید از لطفِ تو — زانکہ خودفرمودۂ لاتقنطوا

قارئین کرام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ حقیر راقم الحروف، اس کے والدین واقارب، اس کے اساتذۂ کرام اوراس کے محبین ومحسنین کوبھی دعائے خیرمیں شامل فرمالیں، وجزاکم اللہُ تعالٰی خیرالجزاء۔

حجازِ مقدس سے واپسی

اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ہمیں ''جامعة الملک سعود، ریاض'' کی طرف سے مختصروقت کے لیے حجازِ مقدس جانے کی اجازت ملی تھی، اس لیے حرمین شریفین کی ہماری یہ پہلی حاضری مختصر ہی رہی، اتنے مختصر وقت میں واپسی

اورحرمین شریفین کی بابرکت فضاؤں سے جدائی کے لیے دل آمادہ نہ تھا، تاہم قانونی مجبوری کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا پڑااور بروز جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ بعدالعصر مدینہ منورہ سے پرنم آنکھوں کے ساتھ ریاض روانہ ہوئے:

حیف! در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

''جامعۃ الملک سعود'' کے شب وروز

احقر نے ''جامعة الملك سعود، رياض'' میں اپنے اساتذۂ کرام کے مشورہ واجازت سے چار بنیادی مقاصد کے پیشِ نظر داخلہ لینے کی سعی کی تھی:

پہلا مقصد: یہ تھا کہ اس صورت میں حرمین شریفین کی حاضری اورحج کی سعادت میسر ہوجائے گی،جس کے لیے عرصہ سے دل تڑپ رہا تھا،اوروسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔

دوسرا مقصد: یہ تھا کہ عربی زبان جوکہ قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زباں ہے اور ہر طالب علم بلکہ ہرمسلمان کی ایک دینی ضرورت ہے، اس میں نکھاراس وقت پیدا ہوسکتا ہے جب کہ طالب علم کو ماحول میں رہنے اوراس زباں کواس کے اصلی سرچشموں سے تلاش کرنے کا موقع ملے، احقر کو یہ امید تھی کہ ''معهداللغة العربية جامعةالملك سعود''میں داخلہ ملنے کی صورت میں اس مقصد کے حصول کا راستہ ہموار ہوجائے گا۔

تیسرا مقصد: یہ تھا کہ دیارِعرب کے علماء ومشائخ جونجی اور بالکل سادہ

طریقے سے مساجد میں علوم دینیہ پڑھاتے ہیں اور اصلاحی بیانات کرتے ہیں ان سے خارجی اوقات میں کچھ نہ کچھ استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

چوتھا مقصد: یہ تھا کہ بالخصوص حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ حلبی شامی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے اور ان کے علوم و معارف سے استفادہ کرنے کا شاید کوئی موقع نصیب ہوگا۔ شیخ ابوغدّہؒ ایک متبحر، متقی اور حنفی المسلک عالمِ دین تھے، اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابرین سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں ان کے علوم و تصانیف کا چرچہ تھا، اور وہ میرے زمانۂ قیام سے پہلے دارالعلوم تشریف بھی لا چکے تھے، موصوف ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، رياض'' کے استاذ تھے جو کہ ''جامعة الملک سعود، رياض'' کے بعد دوسرا بڑا جامعہ تھا، البتہ اُس جامعہ میں داخلہ کی صورت نہیں تھی، تا کہ شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست استفادہ کا موقع مل جاتا، تاہم احقر کو یہ امید ضرور تھی کہ خارجی اوقات میں کسی نہ کسی طرح ان سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مذکورہ چاروں مقاصد کے حصول کے راستے ہموار ہوگئے، چنانچہ ''جامعة الملک سعود'' میں دو سالہ قیام کے دوران پہلا مقصد اس طرح پورا ہو گیا کہ اس مدّت کے اندر حرمین شریفین کی بار بار حاضری اور حج کی سعادت میسر ہوئی، پہلی حاضری ماہ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو میسر ہوئی، جس کی تفصیل درج کی جا چکی ہے، اسی سال اپنی زندگی کا پہلا حج بھی میسر ہوا، اگلے سال ۱۴۰۹ھ کو بھی حج کی سعادت حاصل کر سکتا تھا، اس لیے کہ میں حج کے ایام میں

''جامعة الملک سعود'' میں موجود تھا اور جامعہ میں چھٹیاں بھی چل رہی تھیں، لیکن اس وقت سعودی عرب کا قانون یہ تھا کہ جس شخص نے ایک مرتبہ حج کیا ہو وہ اگلے پانچ سال تک حج نہ کریں، تاکہ حج کے ایام میں زیادہ رَش کی صورت پیدا نہ ہو اور زندگی میں پہلی بار حج کرنے والے حضرات سہولت کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرسکیں، اس قانون کی زَد سے بچنے کے لیے لوگوں نے مختلف راستے ڈھونڈ لیے تھے، لیکن احقر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ''جامعة الملک سعود'' میں داخلہ ملنے کے ذریعہ تو اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین کی زیارت اور فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت سے مجھے نوازا ہے، اب سعوی عرب اور ''جامعة الملک سعود'' کے قانون سے بچنے کے لیے راستے ڈھونڈنا بے وفائی ہوگی اور ایسے حج کو ''حج مبرور'' کہنا بھی مشکل ہوگا، لہٰذا حرمین شریفین کی زیارت کے لیے بے تابی کے باوجود حج کے ایام میں جامعہ میں رہا اور دوسرا حج نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ ۱۴۰۸ھ کے بعد سے تادمِ تحریر جو تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران وقفہ وقفہ سے مزید چار دفعہ (۱۴۱۴ھ-۱۴۲۷ھ-۱۴۲۹ھ-۱۴۳۳ھ) کو حج پر جانے کا موقع نصیب ہوا جس سے مجموعی تعداد پانچ ہوگئی اور متعدد بار عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی:

''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّکَ أَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔''

احقر جب اپنی حقیقت اور کوتاہیوں پر غور کرتا ہے تو اپنے آپ کو ان سعادتوں کا اہل ہرگز نہیں پاتا، اور جب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ''وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ'' (اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے) پر غور کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو یہ

سمجھ میں آتا ہے کہ ارحم الراحمین تو مجھ جیسے نااہلوں کو بھی محروم نہیں فرماتا، لہٰذا یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اپنے بزرگوں اور بالخصوص حضرت حافظ عبدالستار صاحبؒ کی خصوصی دعا (جس کا تذکرہ ہوچکا ہے) کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ روزِ محشر میں بھی اسی طرح رحمت وفضل اور عفو ودرگزر کا معاملہ فرمائے۔

''جامعة الملک سعود'' کے ماحول میں عربی زباں سیکھنے کا ایک اچھا موقع

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ ''معهد اللغة العربية جامعة الملک سعود'' میں داخلہ لینے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ماحول میں رہ کر عربان زباں سمجھنے، بولنے اور لکھنے کا ایک اچھا موقع ملے گا، اسی جذبہ کے تحت میں نے طے کیا تھا کہ ''جامعة الملک سعود'' میں اگر ممکن ہوا تو متشرع، بااخلاق اور باصلاحیت عرب طلبہ کے ساتھ رہائش رکھوں گا، تاکہ ان سے بیک وقت عربی زباں اور اسلامی آداب واخلاق میں استفادہ کیا جاسکے، اور یہ بھی طے کیا تھا کہ ''جامعة الملک سعود'' کے قیام کے دوران صرف فصیح عربی زباں میں گفتگو کرنے کی کوشش کروں گا اور اپنے ہم وطنوں اور ہم زبانوں سے بھی بوقتِ ملاقات وگفتگو کسی اور زباں کے بجائے عربی زباں کو ترجیح دوں گا۔ رہائش سے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ کرم کیا کہ سعودی عرب کے ''شقراء'' نامی شہر کے رہنے والے چند نیک وصالح، پابندِ شریعت اور باصلاحیت طلبہ کے ساتھ رہائش ملی، جن سے روزمرہ کی گفتگو فصیح عربی زباں میں ہوا کرتی تھی، اور کبھی علمی وادبی موضوعات سے متعلق بھی

تبادلۂ خیال ہوجاتا، وہ حضرات آپس میں تو ''اللغة العامّية'' (بگڑی ہوئی زباں) بولتے تھے، لیکن میری رعایت میں مجھ سے ''اللغة الفصيحة'' (فصیح زباں) میں بات کرتے تھے، جس سے مجھے کافی فائدہ ہوا، اپنے ہم وطنوں اور ہم زبانوں سے جب مسجد، مطعم، درسگاہ وغیرہ آتے جاتے ملاقات ہوجاتی اور میں عربی میں بات کرتا تو وہ کچھ ناراض ہوجاتے کہ تم اپنی زبان میں گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ میں عربی زباں کی محبت میں ان کی ناراضگی کو بادلِ نخواستہ برداشت کرلیتا، اس تھوڑی سی محنت وقربانی کا فائدہ یہ ہوا کہ ''وحدة اللغة والثقافة'' کا دوسالہ کورس احقر نے بتوفیق اللہ ایک ہی سال میں پورا کرکے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرلی، اور اگلے سال شعبہ ''اعداد المعلمين'' میں داخلہ ہوا اور اس کا ایک سالہ کورس بھی پورا کیا، اس کے علاوہ پورے جامعہ کی سطح پر منعقد کیے جانے والے تین مسابقاتِ علمیہ میں بھی حصہ لیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دو مسابقات میں پہلی اور ایک مسابقہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی، جن کی بنیاد پر چار سونے کے تمغے (گولڈ میڈل) نقد انعامات اور اپنے کورس کی سند کے علاوہ ''طالب مثالی'' کی ایک خصوصی سند بھی ملی، اور جب دوسال ''جامعة الملك سعود'' میں گزار کر دارالعلوم دیوبند واپسی ہوئی تو دارالعلوم میں بھی احقر کی ہمت افزائی کی گئی، چنانچہ دارالعلوم سے نکلنے والے عربی جریدے ''الداعی'' (۱۲/۶/۱۴۱۰ھ) اور ''ماہنامہ دارالعلوم'' (ماہِ رجب ۱۴۱۰ھ) اور پندرہ روزہ ''آئینہ دارالعلوم'' (یکم تا پندرہ ماہِ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ) تینوں نے حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند (متوفّٰی: ۱۴۱۲ھ) کے ایما پر احقر کی نمایاں کامیابی کی رپورٹ شائع کردی۔ قارئین

کی دلچسپی کے لیے ''آئینۂ دارالعلوم دیوبند'' کے ایڈیٹر جناب مولانا کفیل احمد علوی صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند کی رپورٹ کا متن پیش کیا جارہا ہے:

آئینۂ دارالعلوم کی رپورٹ

مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی مدرس دارالعلوم دیوبند کی ''جامعۃ الملک سعود'' سے دارالعلوم واپسی

''جامعة الملك سعود (ریاض) خلیجی ممالک کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے، جس میں سعودی عرب اور دیگر مختلف ممالک کے تقریباً ۳۶ ہزار طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں، جامعہ میں مختلف ۱۴ کلیات اور ایک ''معهد اللغة العربية'' ہے، دارالعلوم دیوبند کی سفارش پر مولانا کا داخلہ ۱۴۰۸ھ میں شعبہ ''وحدة اللغة والثقافة'' میں ہوا، جس کا دو سال کا کورس ہے، موصوف نے اپنی محنت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے یہ کورس جو کافی اہم ہے، ایک ہی سال میں پورا کرلیا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں امتیازی سند بھی حاصل کرلی، ۱۴۰۹ھ میں یعنی دوسرے سال شعبہ ''اعداد المعلمين'' میں داخلہ ہوا، اس کا ایک سالہ کورس ہے، اس شعبہ میں عام طور پر انہی طلبہ کو داخلہ کا مجاز قرار دیا جاتا ہے، جو سعودی جامعات سے فارغ ہوتے ہیں، اور جن کے نمایاں نمبرات ہوتے ہیں، مولانا عبدالرؤف صاحب کو ''وحدة اللغة العربية'' میں اول پوزیشن حاصل کرنے کی وجہ سے داخلہ کا مستحق قرار دیا گیا، ''معهد اللغة العربية'' جس کے تحت تین شعبے ہیں: ۱:...... وحدة اللغة والثقافة، ۲:...... تدريب المعلمين، ۳:...... اعداد المعلمين، اس میں تقریباً چالیس ملکوں کے طلبہ پڑھتے ہیں، اس پورے ''معهد اللغة العربية'' سے ہر سال

ایک ہی طالب علم کا ''طالب مثالی'' کے عنوان سے انتخاب کیا جاتا ہے، جس کو خصوصی انعام کے علاوہ ایک خصوصی سند ''طالب مثالی'' کے نام سے دی جاتی ہے، انتہائی مسرت کی بات ہے کہ گزشتہ سال ۱۴۰۹ھ میں ''طالب مثالی'' کا عظیم اعزاز مولانا عبدالرؤف صاحب نے حاصل کیا۔ اس کے علاوہ موصوف نے تین مسابقات میں جو کہ پورے جامعہ کی سطح پر منعقد ہوئے شرکت کی:

۱:......قرآن کریم (حفظ تجوید وتفسیر)، ۲:......القراءۃ الحُرّۃ، ۳:......خطابت (عربی زبان میں تقریر)۔ اول الذکر: ۱، ۲ میں مولانا نے فرسٹ پوزیشن اور ۳ میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔

مذکورہ تینوں مسابقات میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے اور ''طالب مثالی'' منتخب ہونے کی وجہ سے تین ہزار سات سو پچاس نقد ریال، متعدد اہم کتابیں، ایک خوبصورت قیمتی بریف کیس، بہترین کاغذ پر طبع شدہ دو قرآن پاک، عربی تقاریر کے کیسٹ اور سونے کے چار میڈل انعام میں دیے گئے۔

پورے جامعہ میں مولانا کی ذہنی وفکری اور علمی صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور یہ تمام تفاصیل سعودیہ کے ہفت روزہ اخبار ''رسالة الجامعة'' میں نمایاں سرخی کے ساتھ شائع کی گئی۔

مولانا عبدالرؤف صاحب دارالعلوم دیوبند کے ایک لائق استاذ ہیں، طلبہ میں مقبول ہیں، اور ذمہ دارانِ دارالعلوم کی نگاہ میں بھی ان کا مقام بلند ہے، درس وتدریس میں انہماک کے ساتھ اہتمام کی جانب سے انہیں دوسری ذمہ داریاں بھی سونپی جاتی رہتی ہیں، ہم موصوف کو ان کی عظیم الشان کامیابیوں پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ (ادارہ)''

عرب علماء سے استفادہ کا موقع

''جامعة الملك سعود'' کے زمانۂ قیام میں اللہ تعالیٰ نے تیسرے مقصد

کے حصول کے لیے اس طرح آسانی پیدا فرمادی کہ خارجی اوقات کے اندر اُن عرب علماء سے استفادہ کرنے کا موقع میسر ہوا جو مساجد میں سادہ طریقے سے پڑھاتے تھے اور اصلاحی بیانات بھی کرتے تھے، جامعہ میں ہفتہ وار دو چھٹیاں (جمعرات اور جمعہ) تو مستقل طور پر ہوا کرتی تھیں، امتحانات سے آگے پیچھے یا کسی اور مناسبت سے چھٹیاں ان کے علاوہ تھیں، اِن چھٹیوں میں میری کوشش ہوتی تھی کہ اُن عرب علماء کی خدمت میں حاضری دیا کروں جو مختلف مساجد میں درس دیا کرتے تھے یا ان کے بیانات ہوتے تھے، تاکہ ان کے علوم واخلاق، عادات و خصائل، طرزِ تدریس وطریقۂ بیان اور عربی لب ولہجہ سے استفادہ کیا جاسکے، میرے پاس نہ تو ذاتی کوئی سواری تھی اور نہ راستوں سے واقفیت اور نہ ہی اُن مشہور علمائے کرام کے نظام الاوقات کا صحیح علم! اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ان مقامی عرب طلبہ اور ساتھیوں کو جو مشہور علمائے کرام کے نظام الاوقات سے متعلق میری راہنمائی فرماتے رہے، اور مناسب وقت پر اپنی ذاتی سواریوں کے ذریعہ بلاتکلف مجھے ان کی مساجد اور دروس و بیانات کے مقامات تک پہنچاتے رہے اور وہ خود بھی ان کے دروس میں شریک ہوتے رہے۔

سعودی عرب کے جن علمائے کرام کے دروس و بیانات میں شرکت اور ان سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ باز رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۴۲۰ھ)، فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۴۲۱ھ)، فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمن بن جبرین رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۴۳۰ھ) سرِ فہرست ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان علمائے کرام کا کچھ تذکرۂ خیر ہوجائے:

سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کا ذکرِ خیر

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں سعودی عرب کے مایۂ ناز عالمِ دین اور مفتی اعظم تھے، ۱۲/ ۱۲/ ۱۳۳۰ھ کو سعودی عرب کے شہر ریاض میں آپ کی پیدائش ہوئی، تین سال کی عمر میں والدِ ماجد کا انتقال ہوا، اور والدہ ماجدہ نے آپ کی تربیت کی ذمہ داری سنبھالی، بچپن میں حفظِ قرآن مکمل کیا اور پھر مزید دینی علوم حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئے، بیس سال کی عمر میں ان کی بینائی مکمل طور پر چلی گئی، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اور بڑے بڑے اہلِ علم حضرات سے مروجہ علوم کی تکمیل کی، ان کے مشہور اساتذہ میں سے شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ، شیخ محمد بن عبداللطیف آل الشیخ، شیخ سعد بن حمد عتیق، شیخ صالح عبدالعزیز آل الشیخ اور شیخ سعید وقاص بخاری رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

علومِ مروجہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنی خداداد صلاحیت وتقویٰ کی بنیاد پر مختلف علمی وانتظامی مناصب پر فائز رہے، چنانچہ ۱۳۵۷ھ تا ۱۳۷۱ھ منطقۂ خرج میں منصبِ قضاء کی نازک ذمہ داری انجام دیتے رہے، اور پھر ''کلیۃ الشریعۃ'' ریاض میں مدرس رہے، اس کے بعد ۱۳۸۱ھ تا ۱۳۹۰ھ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نائب رئیس اور ۱۳۹۰ھ تا ۱۳۹۵ھ اس کے رئیس رہے، اور بالآخر ''إدارۃ البحوث العلمیۃ والإفتاء'' کے رئیس، ملک کے مفتی اعظم اور ''انجمن کبار العلماء'' کے رئیس نامزد کیے گئے، اور اِن عہدوں پر تا وفات فائز رہے۔

شیخ ابن بازؒ سے پہلی بار ٹیلیفون پر رابطہ

۱۴۰۸ھ کو جب احقر کا داخلہ ''جامعة الملک سعود ریاض'' میں ہوا تو ابتدائی دنوں میں ایک روز مطالعہ کے دوران ''حدیثِ قرطاس'' سے متعلق جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری ''کتاب العلم'' (ج:۱،ص:۲۲) کے اندر ذکر کی ہے، کچھ اشکال پیش آیا، جس کے حل کے لیے جامعہ کی لائبریری کا رُخ کیا جہاں صحیح البخاری کی دو اہم شروح (فتح الباری، ج:۱،ص:۲۵۱-۲۵۳) اور (عمدۃ القاری جلد اول جزء ثانی، ص:۱۶۹-۱۷۲) کا مطالعہ کیا، لیکن اشکال پھر بھی مکمل طور پر حل نہ ہوسکا، اس وقت دل میں آیا کہ کیوں نہ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن بازؒ سے بذریعہ فون اس سلسلہ میں استفادہ کیا جائے، کیونکہ ساتھیوں نے بتایا تھا کہ شیخ ابن باز ایک مقررہ وقت پر فون پر بھی سوالات کے جوابات دیتے ہیں، احقر نے مقررہ وقت پر جامعہ کے اندر طلبہ کے لیے لگے ہوئے مفت فون سروس کے ذریعہ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، شیخ کا فون مسلسل مصروف جارہا تھا، لیکن آخر کار رابطہ ہوگیا، احقر نے سلام مسنون کے بعد اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں عبدالرؤف نامی ''معهد اللغة العربية جامعة الملک سعود ریاض'' کا ایک جدید غیر ملکی طالبِ علم ہوں، اور بخاری شریف کی ''حدیثِ قرطاس'' میں مجھے یہ اشکال (تفصیل کا یہ موقع نہیں) درپیش ہے، امید ہے کہ آپ اس کا حل بتادیں گے۔ شیخ نے اپنے الفاظ میں تقریباً وہی پوری بات ذکر فرمادی جو حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہما نے ذکر کی ہے، جس سے ان کے زبردست حافظہ کا اندازہ ہوا، احقر نے مذکورہ حدیث سے متعلق مزید کچھ اشکالات

پیش کیے، جن کے بارہ میں شیخ نے فرمایا کہ: یہ تفصیل طلب اشکالات ہیں، بہتر یہ ہوگا کہ آپ جمعرات کو میرے گھر پر بعد الظہر تشریف لاکر اس موضوع پر گفتگو کریں، اور میرے ساتھ دوپہر کا کھانا بھی کھائیں، میں نے کہا: یہ تو میری سعادت ہوگی! ضرور حاضر ہوں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ!

ہماری یہ گفتگو عربی زبان میں ہورہی تھی جس کی بنیاد پر شیخ نے دورانِ گفتگو احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہوئے عربی لہجہ میں گفتگو کی تحسین فرمائی، اور مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ یہ گفتگو آپس میں غیر متعارف دو آدمیوں کے درمیان نہیں بلکہ ایک مشفق والد اوران کے بیٹے کے درمیان ہورہی ہے، ان کے طرزِ گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود بات کو جلد از جلد ختم کرنا نہیں چاہتے، جب کہ میں تو دل دل میں شرمندہ ہورہا تھا کہ ایک عظیم اور مصروف ترین عالمِ دین کا زیادہ وقت لے رہا ہوں، بات چیت کے دوران میں نے شیخ سے اپنی ''لِلّٰه فی اللّٰه'' محبت کا اظہار بھی کردیا جس کے جواب میں انہوں نے اللہ کی محبت نصیب ہونے کی دعا سے مجھے نوازا، اور آخر میں مَیں نے ان سے دعائے خیر میں فراموش نہ کرنے کی درخواست کی، انہوں نے درخواست کو قبول فرماتے ہوئے مجھ سے بھی یہی فرمائش کی اور بات ختم ہوگئی۔

شیخ ابن بازؒ سے احقر کی پہلی ملاقات

جمعرات کو حسبِ وعدہ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز کی قیام گاہ پر بعد نمازِ ظہر حاضر ہوا جہاں ان کے مہمان خانے میں زائرین و مہمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی، احقر بھی مہمان خانے کے ایک کونے میں شیخ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد شیخ اپنی قیام گاہ کے اندر والے حصہ سے مہمان خانہ تشریف لائے اور محبت بھرے لہجہ میں مہمانوں کو سلام کرنے کے ساتھ ساتھ خوش آمدید کہا اور سب سے بالترتیب **مصافحہ** کیا، جب میری باری آئی اور میں نے ان کو سلام کر کے **مصافحہ** کیا اور آگے اپنا نام بتانے اور فون پر کی گئی گفتگو کا حوالہ دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شیخ نے آواز سے پہچان کر خود ہی میرا نام لیا اور فون پر ''حدیثِ قرطاس'' سے متعلق گفتگو کا حوالہ بھی دے دیا، میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ ایک ایسے شخص جن سے روزانہ بے شمار لوگ ملتے ہیں، اور لاتعداد لوگ فون پر بھی ان سے رابطہ میں رہتے ہیں اور اسّی سال کے قریب ان کی عمر ہے، وہ صرف ایک ہی مرتبہ ایک ادنیٰ اور اجنبی طالبِ علم کی آواز و نام فون پر سن لیتے ہیں اور پھر درمیان میں ایک یا دو دن گزر بھی جاتے ہیں، اس کے بعد لوگوں کے ازدحام کے باوجود جب دوبارہ اس کی آواز سن لیتے ہیں تو فوراً پہچان لیتے ہیں اور نام بھی بتادیتے ہیں!! اب اسے یا تو قوتِ حافظہ کہا جائے، یا فراستِ ایمانی کا نام دیا جائے، یا پھر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بصارت تو ان سے لے لی تھی، لیکن اس کے عوض ان کو بے نظیر بصیرت اور رسوخ فی العلم کی دولت سے مالا مال فرمایا تھا۔

سلام و **مصافحہ** کے بعد میں نے شیخ کے سامنے ''حدیثِ قرطاس'' کا ذکر کیا، شیخ نے حسبِ وعدہ اس پر سیر حاصل بحث کی، جس سے مجھے کافی حد تک تشفی ہوئی، البتہ مکمل تشفی کچھ عرصہ بعد اس وقت ہوئی جب امامِ ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ (متوفّٰی: ۱۰۳۴ھ) کے مکتوبات (بزبانِ فارسی) میں سے ایک مفصل اور تحقیقی مکتوب پڑھنے کا موقع ملا۔ اگر کسی کو اس موضوع پر تحقیق درکار

ہو تو ''فتح الباری'' اور ''عمدۃ القاری'' کے مذکورہ بالا مقامات کے ساتھ ساتھ مکتوباتِ امامِ ربانی دفتر دوم، حصۂ ہفتم، مکتوب نمبر:۹۶، صفحہ نمبر:۱۰۲ تا ۱۱۰ (مطبوعہ: امرتسر و کراچی) کا مطالعہ فرمائیں۔

تھوڑی دیر بعد عربی پلاؤ کے بڑے بڑے گول تھال زمینی دسترخوان پر رکھے گئے اور ہر تھال میں سنت کے مطابق چند افراد شریک ہوئے، شیخ بھی زمین پر بیٹھ کر مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے، ان کے لیے کوئی مخصوص جگہ یا کوئی مخصوص کھانا نہیں تھا، اور نہ ہی لباس یا نشست و برخاست و گفتگو میں کسی قسم کا تکلف شامل تھا، ان کی سادگی کو دیکھ کر کوئی نیا آنے والا زائر یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے زمانہ میں سعودی عرب کے سب سے مشہور عالمِ دین سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز جن کو سرکاری طور پر بھی وزیر کا مقام و عہدہ حاصل ہے اور جن کو سعودی عرب کے بادشاہ بھی والد کا مقام دے کر ''والدُنا وشیخُنا'' سے یاد کرتے ہیں، وہ یہی سادہ شخص ہوں گے، اس نشست میں احقر نے دیکھا کہ شیخ مہمانوں کی مزاج پرسی بھی فرما رہے ہیں اور بلا امتیاز ہر ایک کی بات کو غور سے سن بھی رہے ہیں اور ہر ایک کے سوال کا جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔

شیخ کی مصروفیت اور ان کے علمی و عرفی مقام کے باوجود اتنی خاکساری و فروتنی کہ ہر خاص و عام کی بات کو غور سے سننا اور کسی کو بھی اپنے عالی مقام کا احساس نہ دلانا اس بات کی واضح دلیل تھی کہ وہ آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کو ہمیشہ سامنے رکھتے تھے اور ان کے مطابق عمل بھی کرتے تھے، اور بخاری و ترمذی کی مندرجۂ ذیل دو حدیثوں اور ان جیسی دوسری حدیثوں کو ہمیشہ پیشِ

نظر رکھتے تھے:

۱:... ''عن أنس بن مالك قال كانت الأَمَة من إماءِ أهل المدينة لَتأخذ بيد رسول الله صلى الله عليه وسلم فتنطلق به حيث شاءت''

(رواہ البخاری، ج:۲،ص:۸۹۷)

ترجمہ:''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ والوں کی باندیوں میں سے ایک باندی (بھی یہ کرسکتی تھی کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر جہاں لے جانا چاہتی لے جاتی۔''

۲:... ''عن أنس بن مالك أن امرأة جاءت إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت:إن لي إِليك حاجة فقال:اجلسي في أيّ طريق المدينة شئتِ أجلس إليكِ''

(رواہ الترمذی فی الشمائل:ص ۲۲)

ترجمہ:''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اوراس نے کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:تو مدینہ کے راستوں میں سے جس راستے میں چاہے بیٹھ جاؤ میں تیرے پاس (تیری بات سننے کے لیے) بیٹھ جاؤں گا۔''

یہ شیخ کی پہلی زیارت وملاقات تھی،اس کے بعد بھی موقع بہ موقع ان کے دروس وبیانات میں شرکت کی سعادت ملتی رہی،ان کے بیان سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دل میں امت کی اصلاح کے لیے ایک مضبوط تڑپ اور مستحکم ولولہ موجود ہے،اوروہ جو بات کرتے ہیں وہ صرف زبان سے ادا نہیں ہورہی بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکل کر سامعین کے دلوں سے ٹکراتی ہے۔اسی مضبوط ایمانی جذبہ کا

اثر تھا کہ شیخ اپنے بڑھاپے اور پیرانہ سالی کے باوجود دینی کاموں سے تھکتے نہیں تھے، اور نہ ہی پوچھنے والوں کے بے تحاشا اور بعض غیرضروری سوالات سے غُصیلا پن یا تنگ مزاجی کا شکار ہوجاتے، شیخ کی زندگی کی ایک چشم دید جھلک ذیل میں پیش کی جارہی ہے جس سے ان کے ولولے اور تحمل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

شیخ ابن بازؒ کی بے پناہ مصروفیت وتحمل کا ایک واقعہ

ایک دن شیخ کی خدمت میں احقر ایسے وقت میں حاضر ہوا کہ وہ اپنے دفتر سے نکل کر ذرا فاصلہ پر واقع مسجد میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے پیدل روانہ ہورہے تھے، اس دوران لوگوں کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی ان کے ساتھ موجودتھی، اور جس کو بھی موقع ملتا شیخ سے کوئی سوال کرلیتا، اسی حالت میں مسجد پہنچ کر شیخ نے ظہر کی نماز باجماعت ادا کی، فرض نماز کے بعد دو رکعت سنتِ راتبہ پڑھنے لگے اور جیسے ہی تشہد کے لیے بیٹھ گئے تو ان کی دائیں بائیں جانب لوگ جمع ہونے لگے اور سلام پھیرتے ہی ان سے مسائل پوچھنے لگے اور یہ سلسلہ دفتر واپسی تک جاری رہا، جب دفتر میں داخل ہوئے تو وہاں پر ایک سے زائد ٹیلی فون لائینوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں، اور ٹیلی فون لائن پر موجود ہر شخص شیخ سے بات کرنا چاہتا تھا، ٹیلی فون آپریٹر باری باری شیخ سے ان کی بات کرانے لگے، شیخ ہر شخص کی بات نہایت تحمل سے سن کر جواب دیتے رہے، ٹیلی فون لائینوں پر موجود حضرات کی آواز تو میں نہیں سن سکتا تھا، البتہ شیخ کے جوابات سے یہ اندازہ کرلیتا کہ سائل نے کیا سوال کیا ہوگا! مجھے اس دوران یہ اندازہ ہوا کہ بعض لوگ تو بہت گہرے اور علمی سوالات کررہے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو ایک ہی سوال بار بار پوچھ رہے ہیں

اور غیر ضروری سوالات بھی کر رہے ہیں، لیکن شیخ تحمل کے ساتھ ان سب کی باتیں سن رہے ہیں، اور جوابات دے رہے ہیں۔ اسی دوران یہ بھی مشاہدہ ہوا کہ شیخ کے دفتر کے دو منشی حضرات میں سے ہر ایک مختلف کاغذات اور فائلوں پر مشتمل ایک موٹا پلندا ہاتھ میں لیے ہوئے اس انتظار میں شیخ کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے کہ جیسے ہی شیخ کو کچھ فرصت ملے تو اِن کاغذات و فائلوں سے متعلق اُن کی رائے معلوم کر کے انہیں نمٹا دیا جائے۔

بہر کیف! شیخ ابن بازؒ ٹیلی فون لائنوں پر اطمینان کے ساتھ سوالات کے جوابات بھی دیتے رہے اور درمیان میں جب کوئی تھوڑا سا وقفہ ہوتا اس میں دفتری کام نمٹاتے رہے، اور اتنے زیادہ کام کے باوجود نہ تو ان کے چہرے پر کوئی بل نظر آتا اور نہ ہی اندازِ کلام سے کسی رنجیدگی یا درماندگی کا پتہ چلتا، بلکہ یوں محسوس ہوتا کہ ان کی خواہش و آرزو یہی ہے کہ اس مستعار زندگی کا ہر لمحہ اس ذات کی مرضی میں خرچ ہو جس نے یہ زندگی عطا کی ہے، اور اپنے علم وصلاحیت، شہرت ومقبولیت اور حکومت وعوام دونوں کی سطح پر حاصل وجاہت کو کسی طرح بھی دنیوی، ذاتی اور فانی مفادات کے لیے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ ان کو دینی اور ابدی مقاصد پر لگا دیا جائے، خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر اس کا جائزہ لیتا وہ قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی ایک تصویر اور عملی تفسیر پا لیتا:

”قُلْ إِنَّ صَلاَتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لله رَبِّ الْعَالَمِيْنَ“ (الأنعام:۱۶۲)

یعنی ”کہہ دو بے شک میری نماز اور میری تمام عبادات اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔“

شیخؒ کی وفات اور مسجدِ حرام میں نمازِ جنازہ

شیخ نے اس دنیائے فانی کے اندر اپنی مستعار زندگی کے نواسی سال اور ڈیڑھ مہینہ گزار کر بروز جمعرات ۲۷ محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۹۹۹ء ''طائف'' کے علاقہ میں واقع محلہ ''عودہ'' کے اندر اپنے مکان میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے ساتھ نیکیوں کا ایک بڑا ذخیرہ لے کر واصل بحق ہو گئے۔ اگلے دن بروز جمعہ نمازِ جمعہ کے بعد حرم مکی میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں خادم الحرمین الشریفین، ان کے ولی العہد اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں سمیت ملک و بیرونِ ملک کے بے شمار علماء، صلحاء اور عام مسلمانوں نے شرکت کی، جن کی تعداد روزنامہ ''عکاظ'' (عربی) شمارہ: ۲۹، محرم ۱۴۲۰ھ کی رپورٹ کے مطابق دو ملین افراد سے زیادہ تھی۔ نمازِ جنازہ کے بعد مکہ مکرمہ کے قبرستان ''مقبرۃ العدل'' میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری اور ان کا تذکرۂ خیر

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ سعودی عرب کے ان چیدہ علماء میں سے تھے جن پر وہاں کی سرزمین ناز کرتی ہے، وہ علم وتقویٰ، زہد وقناعت اور ہمدردی واخلاص کے پیکر تھے۔ شیخ ابن عُثیمین اپنے ملک میں ''انجمن کبار العلماء'' کے رکنِ رکین اور کلیۃ الشریعۃ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ (شاخ قصیم) کے استاذ اور ''عُنَیزہ'' شہر کی مشہور جامع مسجد ''الجامع الکبیر'' کے امام و خطیب تھے۔

ان کے علم وتقویٰ سے متعلق میں نے بہت کچھ سنا تھا اور غائبانہ طور پر ان سے کافی متأثر ہوگیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ ان کی خدمت میں حاضری اور ان کے علوم وفیوض سے استفادہ کرنے کا کوئی موقع ملے۔ اللہ کی توفیق سے یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ ''جامعۃ الملک سعود ریاض'' میں پڑھنے کے زمانہ میں چھٹیوں کے دوران چند مرتبہ ''عُنَیزہ'' جاکر ''الجامع الکبیر'' کے اندر ان کے حلقۂ درس میں شرکت اور ان سے ملاقات کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حالات سے واقفیت کا موقع بھی ملا، اسی طرح رمضان المبارک میں مسجد

حرام کے اندر دوسری منزل پر اُن کا درس ہوا کرتا تھا، اس میں بھی حسبِ موقع چند مرتبہ شرکت نصیب ہوئی۔

شیخ کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اور عوام دونوں کی سطح پر مقبولیتِ عامّہ عطا کی تھی۔ سعودی عرب جیسے مالدار ترین ملک میں اپنی مقبولیت سے شیخ نے کوئی ذاتی مفاد حاصل نہیں کیا، بلکہ اپنے اختیار سے اپنے لیے فقر کی زندگی کو ترجیح دی، ان کی زندگی کو سامنے رکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شیخ نے مندرجہ ذیل تین حدیثوں اور ان سے ملتی جلتی دیگر حدیثوں کو صرف پڑھا اور پڑھایا نہیں تھا، بلکہ ان کو حرزِ جان بنا کر اپنی عملی زندگی کا حصہ بنالیا تھا، اور ان حدیثوں میں واقع مسنون دعائیں صرف پڑھتے نہیں تھے بلکہ ان کے مفہوم کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے اپنی طاقت کے بقدر مکمل جد وجہد اور سعی پیہم فرماتے تھے، تین حدیثیں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

۱:۔ ’’عن أبي سعيد رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: اللّٰهم أحيني مسكينا وتوفَّني مسكينا واحشرني في زمرة المساكين‘‘

(رواه الحاكم وصحَّحه ووافقه الذهبي)

ترجمہ: ’’حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں دنیا سے اُٹھانا اور مسکینوں کے گروہ میں میرا حشر فرما۔‘‘

۲:۔ ’’عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اللّٰهم اجعل رزقَ آلِ محمد قُوْتًا وفي رواية كفافاً‘‘ (متفق عليه)

ترجمہ: ’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ

سے یہ دعا کی کہ: اے اللہ! محمد کے گھر والوں کی روزی بس بقدر کفاف ہی رکھیے۔"

٣:۔"عن أبي أمامة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عرض عَلَيَّ ربي ليجعل لي بطحاءَ مكة ذهبًا، فقلت: لايارب! ولكن أشبع يومًا وأجوع يومًا، فإذا جعتُ تضرّعت إليك وذكرتك وإذا شبعت حمدتك وشكرتك"

(رواه الترمذي وحسَّنَه)

ترجمہ: "حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے یہ بات رکھی کہ میرے لیے وہ مکہ کی وادی کے سنگریزوں کو سونا بنادے (اور مجھے اس کا مالک بنادے) تو میں نے عرض کیا کہ: میرے پروردگار! میں اپنے لیے یہ نہیں مانگتا بلکہ میں (ایسی حالت میں رہنا پسند کرتا ہوں کہ) ایک دن پیٹ بھر کے کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں، پس جب مجھے بھوک لگے تو آپ کے سامنے گریہ وزاری کروں اور آپ کو یاد کروں، اور جب آپ کی طرف سے مجھے کھانا ملے اور میرا پیٹ بھرے تو میں آپ کی ستایش اور آپ کا شکر کروں۔"

کچے گھر میں رہنے کو ترجیح دینا اور پکا گھر طلبہ کے لیے وقف کر دینا

شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ واستغناء کا یہ عالم تھا کہ شاہ خالد مرحوم نے اپنے زمانۂ بادشاہت میں "الجامع الكبير" سے متصل ان کے لیے ایک اچھا اور وسیع گھر بنانے کا حکم جاری کر دیا، تاکہ شیخ اپنے پرانے کچے گھر سے اس نئے گھر میں منتقل ہو جائیں، جب نیا گھر بن گیا اور شیخ سے کہا گیا کہ یہ گھر آپ کا ہے، تو انہوں نے "وقفٌ للطلاّب" کہہ کر اس عمارت کو ان طلبہ کے لیے وقف کر دیا جو دور دور سے آکر اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے شیخ کے پاس قیام پذیر ہو جاتے اور خود

اپنے لیے پرانے اور کچّے گھر میں رہنے کو ترجیح دی۔ احقر نے بھی اس وقف شدہ عمارت میں شیخ کی خدمت میں حاضری کے موقع پر مختصر قیام کیا تھا۔ اس عمارت میں طلبہ کے لیے رہائش اور کھانے پینے کے انتظام کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ لائبریری بھی موجود تھی، جہاں یکسوئی کے ساتھ طلبہ مطالعہ کرتے۔ شیخ اپنے کچّے گھر میں قیام پذیر رہے، یہاں تک کہ شاہ فہد مرحوم کا زمانہ آیا، شاہ فہد نے بھی یہ محسوس کیا کہ سعودی عرب جیسے خوشحال ملک کے اتنے بڑے عالمِ دین کچّے گھر میں رہیں! یہ ہرگز مناسب نہیں، چنانچہ انہوں نے مسجد سے کچھ فاصلے پر شیخ کے لیے دوسرا مکان بنانے کا حکم صادر کردیا، جب وہ مکان تیار ہوگیا تو شیخ اس گھر میں پھر منتقل ہونے کے لیے تیار نہ تھے، البتہ ان کے استاد شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے ان کو منتقل ہونے کی دعوت و ترغیب دی، تب وہ منتقل ہوگئے، لیکن طرزِ حیات میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آیا اور اپنی عمر کے آخری لمحات تک فقیرانہ زندگی گزارتے رہے۔

شیخ ابن عثیمینؒ کی قناعت و استغنا کا ایک اور واقعہ

احقر نے ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی جنرل سیکریٹری رابطۂ عالم اسلامی (سابق مدیر جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض) کا ایک عربی مضمون پڑھا تھا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ جب میں ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية'' کا مدیر تھا تو اس وقت ہم نے جامعہ کے تمام اساتذہ کے نام ایک فارم جاری کیا، جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ آپ اپنی تمام علمی سرگرمیوں کی وضاحت تحریر فرمائیں، چاہے وہ سرگرمیاں تصنیف و تالیف کے

میدان سے تعلق رکھتی ہوں، یا تدریس و تعلیم کے میدان سے یا دعوت و اصلاح کے میدان سے ان کی وابستگی ہو، تاکہ آیندہ ان سرگرمیوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر آپ کو ترقی دی جاسکے۔ شیخ ابن عثیمینؒ چونکہ منطقۂ قصیم میں واقع جامعہ کی شاخ میں استاد تھے، اس لیے یہ فارم ان کی خدمت میں بھی بھیج دیا گیا تھا، آگے ہوا یہ کہ دیگر اساتذہ نے تو اپنی اپنی سرگرمیوں کو نمایاں طور پر تحریر فرما کر فارم واپس کردیئے، لیکن شیخ کی طرف سے خالی فارم واپس آگیا، میں (مدیر جامعہ) چونکہ ذاتی طور پر شیخ کی صلاحیتوں اور اعلیٰ علمی و اصلاحی سرگرمیوں سے واقف تھا، حیران رہ گیا کہ شیخ نے کیوں اپنی علمی سرگرمیوں اور تعلیمی و تصنیفی کارناموں کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا ہے؟ بالآخر میں نے ان سے رابطہ کیا کہ: شیخِ محترم! آپ نے اپنی علمی سرگرمیوں اور اصلاحی و دعوتی کارناموں میں سے کسی کا ذکر نہیں فرمایا ہے اور خالی فارم واپس بھیج دیا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ: ''آپ نے اساتذہ کو اپنی اپنی سرگرمیاں تحریر کرنے کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہے کہ ان سرگرمیوں کی بنیاد پر ان کو ترقی دی جائے گی، میں نہ تو ترقی کا خواہشمند ہوں اور نہ ہی میری جو تھوڑی بہت سرگرمیاں ہیں' وہ دنیوی ترقی پر فائز ہونے کے لیے ہیں، اس لیے میں نے کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔''

سنتوں کا اہتمام اور کبھی کبھی ننگے پاؤں چلنا

شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے، ملنے جلنے اور زندگی کے ہر پہلو میں اتباعِ سنت کا اہتمام فرماتے۔ ایک دفعہ میں شیخ

سے استفادہ کی غرض سے ''عُنَیزہ'' شہر حاضر ہوا تھا، میں نے خود مشاہدہ کیا کہ شیخ ''الجامع الکبیر'' میں نماز پڑھانے کے بعد اپنے گھر کی طرف پیدل روانہ ہو گئے جو کہ مسجد سے تقریباً پون کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، راستہ کہیں پکا اور کہیں کچا تھا، مسجد سے گھر جاتے ہوئے ان کے شاگردوں کی ایک جماعت بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی، تا کہ راستہ میں بھی اپنے شیخ سے استفادہ کرتے رہیں، میں بھی استفادہ کی غرض سے ان میں شامل ہو گیا، اس دوران میں نے دیکھا کہ شیخ ننگے پاؤں چل رہے ہیں جبکہ راستہ پورا پکا بھی نہیں تھا، کہیں کہیں مٹی بھی پڑی ہوئی تھی، شیخ کو ننگے پاؤں چلتے ہوئے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی! کیونکہ سعودی عرب میں مسجدوں سے چپل چوری ہونے کے واقعات نہ ہونے کے برابر تھے، پھر خیال آیا کہ شاید شیخ کے چپل ادھر اُدھر ہو گئے ہوں گے یا کسی نے غلطی سے پہن لیے ہوں گے، اس لیے شیخ کو ننگے پاؤں چلنا پڑا ہوگا، ارادہ کیا کہ میں اپنا چپل ان کو پیش کروں، لیکن ان کے شاگردوں کا اطمینان دیکھ کر کچھ شک سا ہو گیا کہ یہ حضرات اپنے شیخ کو ننگے پاؤں چلتے دیکھ کر چونکتے کیوں نہیں؟ اپنے شک کو دور کرنے کے لیے میں نے ان کے ایک شاگردِ رشید سے پوچھا کہ شیخ ننگے پاؤں کیوں چل رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ شیخ مندرجہ ذیل حدیث نبوی پر عمل کے لیے کبھی کبھی ننگے پاؤں چلا کرتے ہیں:

''حضرت عبد اللہ بن بریدہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابیؓ نے حضرت فَضَالہ بن عُبید رضی اللہ عنہ سے- جو کہ مصر میں مقیم تھے- پوچھا کہ آپ کے بال بکھرے ہوئے کیوں ہیں؟ جبکہ آپ اس سرزمین کے امیر بھی ہیں، انہوں نے

فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں زیادہ خوش عیشی سے روکا کرتے تھے۔ صحابیؓ نے ان سے پوچھا کہ: آپ کے پاؤں میں جوتا کیوں نہیں؟ فرمایا کہ: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ وقتاً فوقتاً ننگے پاؤں چلا کرو۔''

(سنن ابوداؤد، کتاب الترجّل، ج:۲،ص:۲۲۰۔مشکاۃ المصابیح، ج:۲،ص:۳۸۲)

شیخ کے شاگرد رشید کی بات سن کر میں شرمندہ بھی ہوا اور اپنی غفلت پر نادم بھی، اور یہ احساس ہوگیا کہ مذکورہ حدیثِ پاک تو ہم نے بھی پڑھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے یاد نہیں رہی تھی، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام سنتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ ابن عثیمینؒ کی رقّتِ قلبی کا ایک واقعہ

موصوف کی رقّتِ قلبی کا ایک واقعہ جو ہفتہ وار عربی مجلہ ''المجتمع'' شمارہ نمبر: ۱۴۳۵، تاریخ: ۲۸ ماہ شوال تا ۵ ماہ ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ میں شائع ہوا ہے، ترجمہ کے بعد نقل کیا جارہا ہے:

''سعودی عرب ریڈیو سے ایک دینی پروگرام ''نورٌ علی الدّرب'' کے نام سے نشر ہوتا ہے جس میں ملک کے مشہور علمائے کرام میں سے کسی عالم کو مدعو کیا جاتا ہے اور وہ لوگوں کے دینی سوالات کے جوابات دیتے ہیں، سوالات تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی، تحریری سوالات اس طرح ہوتے ہیں کہ پروگرام کے میزبان آئے ہوئے خطوط پڑھ کر سناتے ہیں اور زبانی سوالات اس طرح ہوتے ہیں کہ پروگرام کے دوران بذریعہ فون لوگ رابطہ کرکے سوال کرتے ہیں، اور بلائے گئے عالمِ دین جواب دیا کرتے ہیں، اس پروگرام کے لیے وقتاً فوقتاً شیخ ابن عُثیمینؒ کو بھی بلایا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی نے فون کرکے شیخ

سے عرض کیا کہ: میں نے ایک مختصر سا خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر بتا دیجئے۔ شیخ نے فرمایا کہ: یہ پروگرام فقہی سوالات کے لیے ہے، خوابوں کی تعبیر کے لیے نہیں ،اور مجھے خوابوں کی تعبیر سے زیادہ مناسبت بھی نہیں ، اس لیے آپ مجھے معاف فرمائیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ شیخ! چونکہ آپ ہی پر میرا اعتماد ہے، لہٰذا ازراہِ کرم آپ میرا یہ مختصر خواب سن لیجئے اور اگر کوئی تعبیر ذہن میں آجائے' وہ بھی بتا دیجئے۔ شیخ نے ان کے اس اصرار پر کہا کہ بتا دیجئے! آپ نے کیا خواب دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ: اپنے ایک جاننے والے شخص کو میں نے خواب میں اس طرح دیکھا ہے کہ وہ کعبۃ اللہ کے اردگرد ننگا ہو کر طواف کر رہا ہوتا ہے۔ شیخ نے علی الفور تعبیر بتا دی کہ اس خواب سے اس شخص کی عظمت اور قربتِ خداوندی کا پتہ چل رہا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمائی ہے، اس لیے کہ حدیثِ نبوی ہے: ''من حجّ لِلّٰہِ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ أمّہ'' (متفق علیہ) یعنی'' جس نے اللہ کے لیے حج کیا پھر اس میں شہوت اور گناہ کی بات نہیں کی تو وہ اس دن کی طرح ہو کر لوٹے گا جس دن اس کی ماں نے اُسے جنا تھا۔''

مذکورہ حدیث میں مکمل مغفرت سے تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ انسان گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ ولادت کے وقت اس کی حالت ہوتی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ ولادت کے وقت آدمی کے جسم پر کپڑا تو نہیں ہوتا، لہٰذا! اس خواب سے اس شخص کی عظمت اور دربارِ الٰہی میں مقرب ہونے کا پتہ چلتا ہے جس کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے۔ اس پر خواب دیکھنے والی شخصیت نے کہا کہ شیخِ محترم! مبارک ہو، جس شخص کو میں نے مذکورہ حالت میں طواف کرتے ہوئے خواب میں دیکھا ہے، وہ آپ ہی (شیخ محمد بن صالح العثیمین) تھے، یہ سنتے ہی شیخ

پر ایسی رقّت اور رونے کی کیفیت طاری ہوگئی کہ ان کے لیے بولنا مشکل ہوگیا اور اس دن اپنے پروگرام ''نورٌ علی الدّرب'' کو بھی پورا نہ کرسکے اور واپس تشریف لے گئے۔''

افہام وتفہیم میں یکتا

شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے افہام وتفہیم کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا، جب وہ ''الجامع الکبیر، عُنیزہ'' یا مسجدِ حرام کی دوسری منزل پر فصیح وبلیغ عربی زباں میں درس دیا کرتے تو ان کے سمجھانے کے منفرد انداز کی بدولت شرکاء ہمہ تن گوش رہتے اور خاص و عام بہ یک وقت مستفید ہوجاتے، شیخ اپنے درس کے دوران طلبہ سے سابقہ دروس سے متعلق سوالات بھی کرتے، تاکہ وہ غور سے سنا کریں اور دروس کو یاد بھی رکھا کریں۔

احقر کو اپنی تعلیمی زندگی میں چار شخصیات کے اندازِ تدریس نے کافی متاثر کیا ہے، ان شخصیات میں سرفہرست حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم ہیں- جن سے احقر نے اپنی تعلیمی زندگی میں سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے- حضرت مفتی صاحب مشکل سے مشکل مسئلہ کو محسوس مثالوں کے ذریعہ اس انداز پر سمجھا دیتے کہ اعلیٰ اور متوسط صلاحیت والے طلبہ کے ساتھ ساتھ ادنیٰ صلاحیت والے بھی آسانی سے سمجھ جاتے۔

دوسری شخصیت شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جن کے دروس میں احقر

کو چند دفعہ شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور ان کی فصیح عربی زبان اور سمجھانے کے منفرد انداز نے کافی متاثر کیا۔

تیسری شخصیت استاذ حسن خمیس الملیجی کی تھی جن سے ''جامعة الملك سعود رياض'' میں احقر اور اس کے ہم جماعت ساتھیوں نے عربی ادب کا درس لیا۔ موصوف کا تعلق مصر سے تھا اور عربی ادب میں مہارت کے ساتھ ساتھ سمجھانے کی صلاحیت اور خوش مزاجی کی صفت سے بھی خوب مالا مال تھے۔ میں اپنے ساتھیوں سے کبھی ان کے بارہ میں کہا کرتا تھا کہ ہمارے محترم استاذ کے افہام و تفہیم کا انداز تو ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ زیر بحث موضوع کا ایک خوبصورت و باذائقہ لقمہ بنا کر طالب علم کے منہ میں رکھ دیتے ہیں، ساتھی میری اس گفتگو اور مثال سے اتفاق کر لیتے۔

چوتھی شخصیت حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحب مدظلہم العالی (اور اب بہ وقتِ اشاعت ''رحمه الله'' متوفّٰی: ۱۷/۴/۱۴۳۸ھ) صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور بانی جامعہ فاروقیہ کراچی کی ہے، جن سے باضابطہ طور پر احقر کو پڑھنے کا موقع تو نہیں مل سکا ہے، البتہ ان کے بخاری شریف کے صرف ایک سبق میں ایک مرتبہ شرکت کا موقع ملا، جس سے ان کے افہام وتفہیم کے طریقہ کا اندازہ ہوا، موصوف نہایت سہل انداز میں مسائل کو حل کر لیتے اور طلبہ بہ آسانی ان کی بات کو سمجھ لیتے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں صحت و عافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے (اور اب یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے)۔

ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین کا ادب واحترام

شیخ محمد بن صالح العثیمینؒ اگرچہ فرعی مسائل میں اکثر مذہبِ حنبلی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے، تاہم وہ اپنے آپ کو مقلِّد یا کلی طور پر کسی متعین مذہب کے متبع نہیں کہتے تھے، بلکہ وہ اپنی رائے میں جس دلیل کو قوی سمجھتے تھے' اُسی کو ترجیح دینے کے قائل تھے۔ شیخ اور اُن کے ہم مشرب سعودی عرب کے دیگر علمائے کرام کا مذکورہ بالا نقطۂ نظر اگرچہ جمہور علمائے امت کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے، جن کا مسلک یہ ہے کہ اس دورِ انحطاط اور زمانہ خود غرضی وفساد کے اندر مذاہبِ اربعہ مروّجہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے اور اس کے اصول وفروع کی پابندی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں، اور اُن کی آراء کو چھوڑ کر دلیلِ قوی تک پہنچنا اگرچہ ناممکن نہیں، مشکل ضرور ہے۔ راقم بھی ان ہی جمہور علماء کا خوشہ چین اور ان کے شاگردوں میں سے ایک ادنیٰ شاگرد ہے، اس لیے وہ بھی شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ والے مسلک سے اتفاق نہیں کرسکتا، تاہم یہ ناانصافی ہوگی کہ شیخ کی اس خصوصیت و خوبی کو نظر انداز کیا جائے کہ وہ اپنے مذکورہ نقطۂ نظر کے باوجود ائمہ اربعہ اور ان کی اتباع کرنے والے اہل علم کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے علمی مقام کے معترف ا رتقویٰ وطہارت کے قائل تھے۔

شیخ کے شاگردوں میں سے ایک پکے حنفی المذہب شخص مولوی ہدایت اللہ صاحب زید مجدہم نے براہ راست مجھے بتایا کہ میں تقریباً چھ سال تک شیخ کے پاس مقیم رہ کر ان سے پڑھتا رہا اور اُن کے پیچھے نمازیں پڑھتا رہا، ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں نمازوں میں رفعِ یدین نہیں کرتا اور بوقتِ قیام اپنے ہاتھوں کو ناف سے نیچے باندھتا ہوں اور اوقاتِ مکروہہ میں تحیۃ المسجد نہیں پڑھتا وغیرہ، لیکن

چونکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ میں حنفی المذہب ہوں اور حنفی مسلک کے مطابق عمل کررہا ہوں، اس لیے مجھے کبھی نہیں ٹوکا، بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص مجھے ٹوکنے کی کوشش کرتا اس کو بھی منع کردیتے۔

اسی طرح کوئٹہ بلوچستان کے رہنے والے جناب بھائی علاء الدین صاحب تقریباً سترہ سال تک شیخ کی زندگی میں ان کے پاس مقیم رہے اور ان کے طلبہ کی خدمت پر مامور رہے اور تادم تحریر ''الجامع الکبیر'' سے متصل عمارت میں مقیم ہیں، حال ہی میں وہ پاکستان آئے ہوئے تھے تو میں نے ان سے شیخ کے کچھ حالات معلوم کیے، وہ شیخ کا نام سن کر اپنی آنکھوں پر قابو نہ پاسکے اور بتانے لگے کہ: ''ایسا علم دوست اور شفیق و ہمدرد شخص میں نے اپنی زندگی میں ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا ہے، جب ان کو کسی طالبِ علم کے بارہ میں یہ اندازہ ہوجاتا کہ یہ صحیح معنوں میں طلب علم میں لگا ہوا ہے تو اس کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ اہمیت دیتے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کا متبع شخص اگر ان سے مسئلہ معلوم کرلیتا اور انہیں معلوم ہوجاتا کہ یہ فلاں مسلک کا متبع ہے تو اُسے اس کے مسلک کے مطابق جواب دیتے اور کبھی اس پر ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔''

کینسر کا عارضہ اور بیرونِ ملک علاج سے انکار

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زندگی کے آخری دو سالوں میں کینسر کا عارضہ لاحق ہوگیا، اس حالت میں بھی انہوں نے اپنے معمولات کو برقرار رکھا اور صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہے۔ سعودی حکومت نے بارہا بیرونِ ملک علاج کرانے کی پیشکش کی، جسے وہ ٹالتے رہے، بالآخر حکومت اور بعض متعلقین

کے اصرار پر بادل ناخواستہ تیار ہو گئے اور حکومت کی طرف سے امریکا میں ان کے علاج کا بندوبست کیا گیا، لیکن وہاں پر پہنچنے کے بعد ڈاکٹروں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ علاج کی صورت میں دواؤں کی شدّت سے ان کے بال جھڑ جائیں گے، اس پر شیخ نے یہ کہتے ہوئے علاج سے انکار کر دیا کہ موت تو برحق اور اس کا وقت مقرر ہے، میں ایسا علاج نہیں کرانا چاہتا جس سے میری داڑھی کے بال نہ رہیں اور میں داڑھی کے بغیر قبر میں پہنچ جاؤں! لہٰذا علاج کرائے بغیر واپس تشریف لائے، اور اپنے معمولات کو بیماری کی شدّت کے باوجود جاری رکھنے کی کوشش فرماتے رہے، جب بیماری نے زیادہ شدّت اختیار کی تو جدّہ کے ایک ہسپتال ''المستشفی التخصّصی'' میں ان کو داخل کرایا گیا، چنانچہ ماہِ رمضان کے آخری ایام میں وہ مذکورہ ہسپتال میں رہے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ رمضان کی آخری رات میں انہوں نے مسجد حرام جانے کا اصرار شروع کیا اور فرمایا کہ: مجھے رمضان کی برکات سے محروم نہ کریں، لہٰذا ان کے اصرار پر اسٹریچر پر لیٹے ہوئے ایسی حالت میں ان کو مسجد حرام منتقل کیا گیا کہ آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں، اسی حالت میں مسجد حرام میں مغرب و عشاء کی نمازیں ادا کیں اور تراویح کے بعد اپنے سابقہ معمول کے مطابق لاؤڈ اسپیکر کا تقاضا کیا اور درس دینے لگے، ڈاکٹر تو ان کے ضعف و نقاہت اور بیماری کی کیفیت کو دیکھ کر سخت اضطراب میں مبتلا تھے، لیکن شیخ اطمینان کے ساتھ درس دیتے رہے، یہ مسجد حرام میں ان کی زندگی کا آخری درس تھا، اس لیے کہ عید کے دن پھر ان کو مذکورہ ہسپتال منتقل کیا گیا، جہاں چند ہی دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

شیخؒ کی ولادت و تعلیم و تعلّم

شیخ محمد بن صالح العثیمینؒ کی ولادت ۲۷/۹/۱۳۴۷ھ کو منطقہ ''قصیم'' میں واقع ''عُنیزہ'' شہر میں ہوئی، اور جیسے ہی پڑھنے کے قابل ہوئے تو والد ماجد نے دینی تعلیم میں لگا دیا، چنانچہ بچپن ہی میں قرآن پاک کا حفظ مکمل کیا، پھر فضیلۃ الشیخ عبدالرحمن بن ناصر السعدی سے صرف ونحو، تفسیر و حدیث، سیرت و عقیدہ، فقہ و اصول فقہ اور علمِ میراث کی تعلیم حاصل کی، پھر اپنے مذکورہ شیخ کی اجازت سے ''المعهد العلمی'' ریاض میں داخل ہوئے اور فضیلۃ الشیخ المفسّر محمد الأمین الشنقیطی اور فضیلۃ الشیخ الفقیہ عبدالعزیز بن ناصرؒ جیسے اہل علم سے استفادہ کیا، اُسی دوران سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ سے تعلق پیدا ہوا اور مسجد میں ان سے بخاری شریف اور دیگر مختلف کتابیں پڑھیں اور شیخ عبدالرحمن السعدیؒ کے بعد سب سے زیادہ استفادہ شیخ ابن بازؒ سے کیا اور اسی وجہ سے شیخ عبدالرحمن السعدیؒ کو ان کے شیخِ اول اور شیخ ابن بازؒ کو ان کے شیخِ ثانی کہا جاتا ہے۔

درس وتدریس اور تصنیف وتالیف

فراغت کے بعد اپنے شیخِ اول کے حکم سے ''المعهد العلمی عنیزہ'' میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا، ۱۳۷۶ھ کو ان کے شیخِ اول کا انتقال ہوا تو ان کو اپنے شیخِ اول کی جگہ ''الجامع الکبیر عنیزہ'' میں امام وخطیب مقرر کیا گیا، جہاں امامت وخطابت کے ساتھ ساتھ تدریس کی ذمہ داری بھی نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی وفات تک انجام دیتے رہے، اور ۱۳۹۸ھ سے اپنی وفات تک ''کلیة الشریعة، جامعة

الإمام محمد بن سعود الإسلامية''(شاخ قصیم) میں بھی تدریس کی ذمہ داری انجام دیتے رہے، اس کے علاوہ ماہِ رمضان اور ایامِ حج اور سالانہ چھٹیوں میں مسجدِ حرام کی دوسری منزل میں ان کا حلقۂ درس ہوتا تھا، جس میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ شیخ ابن عثیمین ''انجمن کبار العلماء'' کے رکن رکین اور چالیس سے زیادہ کتابوں اور رسائل کے مؤلف بھی تھے۔ ان کے بے شمار شاگرد ملک و بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنی گفتار و کردار کے ذریعہ طلبہ کی تربیت پر بھی خوب توجہ دیتے تھے۔ ان کے سامنے قضاء کا منصب بھی پیش کیا گیا، لیکن انہوں نے قبول کرنے سے معذرت کی۔

شیخ ابن عثیمینؒ کا وصیت نامہ

شیخ نے اپنی وفات سے پہلے اپنی اولاد اور طلبہ کے لیے ان کی خواہش پر مندرجہ ذیل وصیت نامہ تحریر فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کا معاملہ کیسا ہو؟''

۱:...... اللہ تعالیٰ کو ہر حالت میں یاد رکھئے اور اس کی قدرت کی نشانیوں جیسے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور ان میں اللہ کی پوشیدہ حکمتوں، رحمتوں اور احسانات پر غور کیجئے اور اللہ تعالیٰ کے ان احکام شرعیہ پر بھی غور کیجئے جن کے ساتھ اپنے انبیاء اور بالخصوص خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے۔

۲:...... آپ کا دل اللہ کی محبت سے اتنا لبریز ہونا چاہیے کہ اس کی محبت سب پر غالب رہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار انعامات سے نوازا ہے،

بالخصوص ایمان اور دین پر استقامت کی نعمت سے، اور شرور وفتن سے بچایا ہے۔

۳:...... آپ کے قلب میں اللہ کی بے پناہ محبت کا یہ اثر ہونا چاہیے کہ آپ اللہ کے تمام اوامر کی پابندی کریں اور منہیات سے اجتناب کریں۔

۴:...... اللہ کی تمام عبادات میں اخلاص کا استحضار رکھئے اور اپنی زندگی کے تمام امور میں اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کا اہتمام کیجئے، تاکہ آپ ''إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کہنے میں سچے ثابت ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں آپ کا معاملہ کیسا ہو؟

۱:...... اللہ کی مخلوق میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت دیگر تمام محبتوں پر غالب رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر طریقہ وسنت کو دوسرے لوگوں کے طریقوں پر ترجیح دیجئے۔

۲:...... تمام عبادات و اخلاق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا پیشوا بنالیں اور ہر عبادت میں اس بات کا استحضار رکھئے کہ آپ ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اسی طرح لوگوں سے ملنے جلنے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق فاضلہ کی پیروی کیجئے جن سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وإنك لعلٰى خلق عظيم'' (اور بے شک تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو) مذکورہ اہتمام سے آپ کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت سمجھنے اور آپ کے اخلاق جاننے کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

۳:...... نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کا دفاع کیجئے اور لوگوں کو ان کی طرف بلانے اور دعوت دینے کا اہتمام کیجئے اور آپ جتنا بھی شریعتِ مصطفوی کا دفاع کریں گے، اللہ تعالیٰ اتنا ہی آپ کے ساتھ تعاون فرمائیں گے۔

فرائض کے علاوہ آپ کے روزمرہ معمولات کیا ہوں؟

۱:......رات کے آخری حصہ میں اُٹھ کر اللہ کو یاد کیجئے اور اللہ سے جو چاہیں مانگیں، اس لیے کہ رات کا وہ حصہ دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے اور سورۂ آل عمران کی آخری آیتیں ''إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ '' سے لے کر اختتام سورت تک پڑھا کیجئے۔

۲:......رات کے آخری حصہ میں تہجد کی نماز جتنی ہو سکے ادا کیجئے اور آخر میں وتر پڑھا کیجئے۔

۳:......صبح کے ذکر واذکار کی پابندی کیجئے، ایک سو دفعہ ''لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو علٰى كلّ شيء قدير '' پڑھا کیجئے۔

۴:......اشراق کی دو رکعت نماز پڑھا کیجئے۔

۵:......شام کے ذکر واذکار کی حسبِ توفیق پابندی کیجئے۔

علم حاصل کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

۱:......حفظِ قرآن کا اہتمام کیجئے اور روزانہ ایک متعین حصہ کی تلاوت پابندی اور غور وخوض کے ساتھ کیجئے، اور تلاوت کے دوران جو علمی فوائد ذہن میں آجائیں انہیں قلمبند کیجئے۔

۲:......مستند احادیث نبویہ میں سے جتنی حدیثیں حفظ کر سکتے ہیں کر لیجئے، اور بالخصوص ''عمدة الأحكام '' (تالیف: حافظ عبد الغنی مقدسی رحمۃ اللہ علیہ) حفظ کرنے کی کوشش کیجئے۔

۳:......علم پوری توجہ وترتیب کے ساتھ حاصل کیجیے، ایسا نہ ہو کہ کچھ اِدھر سے لیا، کچھ اُدھر سے لیا، اس لیے کہ اس سے آپ کا وقت ضائع ہوگا اور ذہن بھی تردّد میں مبتلا ہوگا۔

۴:...... ہر فن کی ابتدائی کتابیں پوری توجّہ کے ساتھ پڑھیے، پھر بتدریج آگے بڑھتے رہیے، تاکہ علم میں پختگی اور اطمینان پیدا ہو جائے۔

۵:...... ہر فن کے اصول وقواعد کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجیے اور اہم باتوں کو قلمبند بھی کیجیے، مشہور مثال ہے: ''من حُرِمِ الأصولَ حُرِمِ الوصولَ'' (جو اصول وقواعد سے محروم ہوا وہ منزل مقصود تک پہنچنے سے محروم ہوا)۔

٦:...... اپنے استاد یا قابل اعتماد ذی علم ساتھیوں میں سے کسی کے ساتھ علمی مسائل میں بحث ومباحثہ کا اہتمام کیجیے اور اگر علمی مباحثہ کے لیے کوئی میسّر نہ ہو تو اپنے ذہن میں یہ تصور قائم کیجیے کہ علمی مسائل کے اندر آپ کے ساتھ کوئی بحث و مباحثہ کر رہا ہے، تاکہ آپ مسائل کی گہرائی تک پہنچ سکیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو علمِ نافع وعملِ صالح عطا فرمائے اور آپ کے علم میں اضافہ کردے اور آپ کو نیک اور کامیاب لوگوں میں شامل فرمادے۔ والسلام علیکم ورحمة الله وبركاته ''

شیخؒ کی وفات اور مسجدِ حرام میں نمازِ جنازہ

فضیلة الشیخ العلامہ محمد بن صالح العثیمینؒ نے اس دارِفانی میں تقریباً چھتر سال کی زندگی گزار کر بروز بدھ ۱۵/ ۱۰/ ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۰/ ۱/ ۲۰۰۱ء کو مغرب

سے ذرا پہلے شہرِ جدّہ میں داعی اجل کو لبّیک کہا، اور اگلے دن عصر کی نماز کے بعد مسجدِ حرام میں امامِ حرم فضیلۃ الشیخ محمد بن عبداللہ السُّبَیِّل کی امامت میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں سعودی اخبارات کے مطابق تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے شرکت کی، جو خصوصی گاڑیوں، بسوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ ملک کے طول وعرض سے ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے مسجد حرام پہنچے تھے۔ بعد نمازِ جنازہ ان کے جسد خاکی کو مکّہ مکرمہ کے قبرستان ''مقبرۃ العدل'' میں سپردِ خاک کیا گیا، جہاں ان کے محترم استاذ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کو سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

شیخ عبد اللہ بن عبد الرحمٰن بن جبُرین رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ اور ان کا مختصر تذکرہ

فضیلۃ الشیخ الدکتور عبد اللہ بن عبد الرحمن بن جبرین رحمۃ اللہ علیہ بھی سعودی عرب کے مایۂ ناز اور مشہور علماء میں سے تھے، علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی اور دنیا سے بے رغبتی ضرب المثل تھی، ''جامعة الملك سعود'' میں قیام کے دوران احقر اپنے مخلص دوستوں اور ساتھیوں کے ذریعہ غائبانہ طور پر ان کی علمی صلاحیتوں اور زہد و تقویٰ سے واقف ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ریاض کی مختلف مساجد میں وہ درس دیا کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کے بیانات ہوتے ہیں، میری ایک دلی تمنا تھی کہ ان کی خدمت میں حاضری اور ان سے استفادہ کا کوئی موقع میسّر آ جائے، حسنِ اتفاق سے ایک دن ''جامعۃ الملک سعود'' کی مرکزی جامع مسجد میں اعلان آویزاں ہو گیا کہ بروز اتوار ۱۱/رجب ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۸۸ء عصر کی نماز کے بعد ''أهميّة عمارة المساجد عمارةً معنويةً'' (مسجدوں کو معنوی طور پر آباد کرنے کی اہمیت) کے موضوع پر فضیلۃ الشیخ الدکتور عبد اللہ بن عبد الرحمن بن جبرین کا خطاب ہوگا، اس اعلان کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا اور اتوار کے دن کا انتظار کرتا رہا، اتوار کو عصر سے پہلے مذکورہ مسجد پہنچ کر میں نے

دیکھا کہ شیخ کا بیان سننے کے لیے عام دنوں کے اعتبار سے لوگوں کی زیادہ تعداد اس مسجد کی طرف متوجہ ہے، ان لوگوں کے درمیان میں نے یہ بھی دیکھا کہ عربی لباس میں ملبوس ایک معمّر شخص اسی مسجد کی طرف جارہے ہیں اور لباس ورفتار میں اتنی سادگی ہے کہ میرے ذہن میں یہ آیا کہ غالباً یہ ایک عام دیہاتی شخص ہیں جن کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ یہاں پر شیخ ابن جبرین کا بیان ہونے والا ہے، اس لیے وہ بھی سننے کے لیے آگئے اور دل میں یہ بھی آرہا تھا کہ یہ بے چارے سیدھے سادے دیہاتی شخص اتنے بڑے شیخ کا علمی بیان کیسے سمجھیں گے؟

بہر صورت! عصر کی نماز ادا کی گئی اور امام مسجد نے اعلان کیا کہ فضیلۃ الشیخ عبد اللہ بن عبدالرحمن بن جبرین کا بیان ہونے والا ہے، آپ حضرات شرکت فرمائیں اور یہ بھی کہا کہ شیخ سے درخواست ہے کہ آگے منبر کی طرف تشریف لے آئیں، اس اعلان کے بعد احقر کی نگاہیں اس تجسُّس میں لگی ہوئی تھیں کہ کون شخص منبر کی طرف بڑھتے ہیں، اتنے میں وُہی شخص جن کو میں دیہاتی سمجھ رہا تھا آگے بڑھے اور منبر پر تشریف فرما ہوئے، مجھے اپنی خام خیالی پر دل میں ندامت و شرمندگی محسوس ہوئی، اس لیے کہ جن کو میں ایک معمولی شخص سمجھ رہا تھا' وہی فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن جبرین تھے۔

ان کی خاکساری اور سادگی کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ سعودی عرب جیسے خوشحال ملک کے اندر اتنے مشہور وجلیل القدر عالمِ دین کی اتنی فروتنی و خاکساری اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انہوں نے دنیا کی بے وقعتی اور آخرت کی اہمیت کا صحیح معنوں میں ادراک کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مستعار زندگی کے قیمتی

لمحات اور اپنی صلاحیتوں کو دنیوی خواہشات وذاتی مفادات میں ضائع کرنے کے ہرگز قائل نہیں، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کا ہر لمحہ اللہ کی رضا اور دین کی خدمت میں خرچ ہو۔

شیخ نے فصیح عربی زباں اور بے تکلف انداز میں مساجد کی اہمیت اور ان کو معنوی طور پر آباد کرنے سے متعلق قرآن وسنت اور سلفِ صالحین کے اقوال و واقعات کی روشنی میں علمی بیان کیا اور لوگوں کو ترغیب دی کہ مساجد کو نماز وعبادت اور تعلیم ودعوت الیٰ اللہ کے ذریعہ آباد کرنے کی کوشش کریں۔ شیخ کے اندازِ بیان سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے دل میں ایک درد ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان اپنے دین پر استقامت کے ساتھ قائم رہے اور مساجد پانچوں اوقات میں نمازیوں سے آباد رہیں، اور چونکہ کندھے سے کندھا ملا کر باجماعت نماز ادا کرنے سے مسلمانوں کو آپس میں اتحاد واتفاق کا درس ملتا ہے، اس لیے مسلمان اس درس کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اس کو عملی جامہ ضرور پہنائیں۔

شیخ ابن جبرین سے احقر کی یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی، دلی تمنا کے باوجود دوبارہ ان سے ملاقات یا ان کے کسی درس میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کرسکا، البتہ ان کے شاگردوں اور جاننے والوں سے ان کے واقعات واحوال دریافت کرتا رہتا۔ ایک دفعہ ایک بااعتماد سعودی ساتھی نے ان کی خاکساری کا ایک عجیب واقعہ سنایا، اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ شیخ کسی رَش والی جگہ میں گزرگاہ کے کنارے کسی کے انتظار میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، اتفاق سے وہاں پولیس والوں کی گاڑی گزر رہی تھی، پولیس والوں کو ان کے سادہ لباس اور گزرگاہ کے کنارے بیٹھنے سے

شبہ ہوا کہ یہ کوئی مانگنے والا شخص ہے، پولیس والے شیخ کے نام سے تو واقف تھے، البتہ شکل وصورت سے ان کو نہیں جانتے تھے اور نہ ہی یہ اندازہ کر سکے کہ یہ کوئی عالمِ دین ہیں، اور چونکہ سعودی عرب میں سوال کرنا منع ہے، اس لیے ان کو سائل سمجھ کر گاڑی میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے گئے، پولیس اسٹیشن میں موجود افسر جو شیخ کو جانتے تھے، بے حد شرمندہ ہوئے اور معافیاں مانگنے لگے اور اپنے ماتحتوں کو ڈانٹا کہ تمہیں پتہ بھی ہے کہ یہ کون ہیں؟ شیخ نے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا، بلکہ سب کو معاف کر دیا۔

شیخؒ کی سخاوت ورحم دلی

موصوف کے شاگردوں میں سے ایک نوجواں شاگرد شیخ اسحاق بن ہارون الرشید ہیں، جو مکہ مکرمہ میں مقیم اور مسجدِ حرام میں مدرس ہیں، ان کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ شیخ بے انتہا رحم دل اور صاحبِ سخاوت انسان تھے، جب کسی شخص کے بارہ میں ان کو معلوم ہوتا کہ وہ حاجت مند ہے اور اس کو اور اس کے خاندان کو کھانے پینے کے سامان کی ضرورت ہے تو ضروری سامان لے کر اس کے گھر پہنچ جاتے اور گھر کے دروازے کے ساتھ سامان رکھ کر دستک دے دیتے اور چلے جاتے، تاکہ ضرورت مند کو سامان بھی ملے اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ یہ کس نے دیا ہے؟ شیخ اسحاق نے اپنے استاذ محترم فضیلۃ الشیخ ابن جبرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ بھی بتایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مکّہ مکرمہ جا رہے تھے، سفر کے دوران کسی سائل نے ان سے کچھ مانگا، انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سائل کو دینے کے لیے کوئی

چھوٹا نوٹ تلاش کیا، لیکن اتفاق سے پانچ سو ریال کا نوٹ نکل آیا، جسے سائل نے دیکھ لیا، شیخ نے اُنہیں دوبارہ جیب میں ڈال کر چھوٹا نوٹ تلاش کرنا چاہا، اس دوران اُنہیں محسوس ہوا کہ سائل کے چہرہ پر مایوسی چھا گئی، شیخ نے مایوسی کی تلافی کے لیے پھر سے وہی پانچ سو کا نوٹ نکال کر سائل کو دے دیا۔

احقر کو فضیلۃ الشیخ ابن جبرین رحمۃ اللہ علیہ کی اس ایک ملاقات اور ایک بیان میں شرکت کرنے اور دوستوں و ساتھیوں سے ان کے مذکورہ بالا جیسے عبرت انگیز واقعات سننے سے بڑا فائدہ محسوس ہوا، اور آج تک جب بھی دنیا کی زیب و زینت اور اس کی آرائش و رعنائیت میں پھنسنے کے مواقع سامنے آتے ہیں تو شیخ ابن جبرین رحمۃ اللہ علیہ اور ان جیسے دیگر اکابرین کی سادگی اور دنیا سے بے رغبتی کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دنیا کی محبت سے نجات کی دعا کرتا ہوں۔

شیخ ابن جبرینؒ کی تاریخِ ولادت و وفات

فضیلۃ الشیخ الدکتور عبداللہ بن عبدالرحمن بن جبرین کی ولادت ان کے شاگرد شیخ اسحاق کے بقول ۱۳۴۹ھ کو اور عربی ماہنامہ ''مجلّة الحجّ والعمرة'' ماہِ رمضان ۱۴۳۰ھ کی تصریح کے مطابق ۱۳۵۲ھ کو ہوئی تھی، اور انہوں نے اپنی مستعار زندگی کے تقریباً اٹھتر یا اکیاسی سال اس دنیائے فانی میں گزار کر نیک اعمال کے ایک بڑے ذخیرہ کے ساتھ ۲۰/رجب ۱۴۳۰ھ کو داعیِ اجل کو لبّیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائے۔

حضرت شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کا موقع اور اُن کا تذکرۂ خیر

اس سے پہلے یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ''جامعة الملک سعود ریاض'' میں احقر کے داخلہ لینے کے چار بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد فضیلۃ الشیخ عبد الفتاح ابوغدّہ الحلبی الشامی الحنفی قدّس سرُّہٗ سے خصوصی طور پر استفادہ کرنا تھا، شیخ کا ذکرِ خیر احقر نے پہلی بار دار العلوم دیوبند میں اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم سے اس وقت سنا تھا' جب میں دورۂ حدیث کا طالبِ علم تھا، حضرت مفتی صاحب وقتاً فوقتاً دورانِ سبق ان کا ذکر خیر اور اُن کی تصانیف کا حوالہ دیا کرتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ ایک زبردست محدّث وفقیہ اور حنفی المذہب عالم ہیں اور ہمارے اکابرین کے بے حد معتقد ہیں، دارالعلوم دیوبند سے گہری محبت رکھتے ہیں اور دارالعلوم تشریف بھی لاچکے ہیں۔

فراغت کے بعد جب اپنی مادرِ علمی دار العلوم دیوبند میں احقر کا تقرُّر رہا تو اس وقت شیخ ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور ان کے علمی مقام سے مزید آگاہی ہوئی اور حضرت علّامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' اور حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ''مقدّمة إعلاء

السنن''، اور حضرت مولانا عبد الحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل'' اور ان کی دوسری کتاب ''الأجوبة الفاضلة'' پر شیخ کی بے نظیر تحقیق وتعلیق اور دارالعلوم دیو بند اور ہمارے اکابرین سے متعلق ان کے عقیدت مندانہ تاثرات کا انکشاف بھی ہوا، لہٰذا غائبانہ طور پر ان سے محبت و عقیدت پیدا ہوگئی اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية رياض'' میں استاذ ہیں، مذکورہ جامعہ میں داخلہ لینے کی صورت نہیں بن رہی تھی، البتہ ''جامعة الملک سعود رياض'' میں داخلہ کی صورت بن گئی اور اس بہانے شیخ ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہونے کی امید پیدا ہوگئی۔

شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات

جب احقر کا داخلہ ''جامعة الملک سعود رياض'' میں ہوگیا اور ۳۰ محرم ۱۴۰۸ھ کو ریاض پہنچ کر مذکورہ جامعہ میں مقیم ہوگیا، تو بالکل ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ جامعہ کے قریب کتابوں کی ایک عالمی نمائش لگی ہوئی ہے، جس میں مختلف قسم کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ راقم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک دن مغرب وعشاء کے درمیان اس نمائش میں پہنچ گیا اور کتابوں کی تلاش میں مصروف ہوگیا، اُسی دوران ایک سفید ریش سرخ وسفید نورانی چہرہ والے ایسے شخص کو لگن کے ساتھ کتابوں کو تلاش کرتے ہوئے میں نے دیکھا جن کے چہرے سے علم وتقویٰ، خوش اخلاقی واخلاص اور ہمدردی و دیانت داری کے جلوے پھوٹ

رہے تھے، ایک ساتھی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جانتا تو نہیں، لیکن ان کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت وتقویٰ کے مالک شخص ہوں گے، ساتھی نے کہا کہ: یہ مشہور ومعروف حنفی عالمِ دین شیخ عبد الفتاح اَبو غدّہ ہیں، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور فوراً آگے بڑھا اور ادب واحترام کے ساتھ سلام کر کے ان سے مصافحہ ومعانقہ کیا اور مزاج پرسی کی، شیخ نے بھی بہت ہی شفقت ومحبت کے انداز میں خیریت معلوم کر کے مجھے اپنا تعارف کرانے کا حکم دیا، میں نے اپنا نام اور ''جامعة الملک سعود'' میں حال ہی میں داخلہ لینے کا ذکر کیا، ساتھیوں نے دار العلوم دیو بند سے میری تدریسی وابستگی کا ذکر بھی کر دیا، جس سے وہ بے حد خوش ہوئے اور دار العلوم دیو بند اور اس کے مشائخ وطلبہ کے حالات معلوم کیے اور فرمایا کہ: دار العلوم دیو بند تو ایک ایسا دینی مرکز ہے جس نے ہزاروں علماء، مفکّرین، مصنّفین اور مجاہدین پیدا کیے، پھر دار العلوم کے چند مخصوص ان اساتذۂ کرام کے حالات معلوم کیے جن کو شیخ ذاتی طور پر جانتے تھے اور ہندوستان کے چند دیگر علماء کے حالات بھی دریافت کیے۔

شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ اچانک ملاقات احقر کے لیے باعثِ خوشی اور ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی، جس نے کتابوں کی نمائش میں جانے کا اصل مقصد بھلا دیا اور دل یہ چاہ رہا تھا کہ ان خوشگوار لمحات کا دورانیہ طویل ہو! لیکن نمازِ عشاء کا وقت قریب آ گیا اور ہم سب لوگ مسجد کی طرف روانہ ہو گئے اور مختصر وقت میں یہ پہلی اور دلچسپ ملاقات اگرچہ اپنے اختتام کو پہنچی، تاہم اس نے شیخ کی محبت وعقیدت میں

اضافہ کر دیا اور اس ارادے کو بھی مضبوط بنا دیا کہ ریاض میں موجودگی کے دوران شیخ سے ان شاء اللہ تعالیٰ! استفادہ کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

شیخ عبد الفتاح ابو غُدّہؒ کی ''جامعة الملک سعود'' منتقلی اور احقر کے لیے استفادہ کا ایک نادر موقع

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ شیخ ابو غُدّہ ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية رياض'' کے استاذ تھے اور میرا داخلہ ''جامعة الملک سعود رياض'' میں ہوا تھا، اور یہ دونوں الگ الگ مستقل علمی ادارے ہیں اور ریاض شہر کے اندر دونوں کا محلِ وقوع بھی جدا جدا ہے، اس لیے شیخ سے استفادہ کرنے میں دشواری تھی، کیونکہ نہ تو میرے پاس کوئی ذاتی سواری تھی اور نہ وقت میں اتنی گنجائش تھی کہ میں روزانہ ''جامعة الملک سعود'' کے اوقاتِ درس میں بھی حاضر رہوں اور پھر ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية'' جا کر شیخ کی خدمت میں بھی حاضری دیا کروں، لہٰذا اس پر غور کر رہا تھا کہ ہفتہ وار چھٹیوں (جمعرات اور جمعہ) اور اسی طرح دیگر چھٹیوں میں شیخ سے استفادہ کی کوئی ترتیب بناؤں گا۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میرے داخلہ کو ابھی مختصر ہی عرصہ ہوا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ ''جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية'' سے ''جامعة الملک سعود'' منتقل ہو رہے ہیں، جہاں ''كلية التربية'' کے آخری سال کے طلبہ اور دراساتِ علیا کے طلبہ کو علومِ حدیث پڑھائیں گے، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، اس لیے کہ اس صورت میں شیخ سے استفادہ کرنے کی

میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہوجاتی۔

''جامعة الملک سعود''میں میرا داخلہ شعبہ''معھد اللغة العربیة''میں ہوا تھا اور شیخ شعبہ''الثقافة الإسلامیة، کلیة التربیة''میں پڑھانے لگے، لہٰذا باضابطہ طور پر تو میرا کوئی سبق ان کے پاس نہیں تھا، لیکن حسنِ اتفاق سے''معھد اللغة العربیة''میں میرے اسباق صبح کے وقت ہوتے تھے اور شیخ''کلیة التربیة''میں شام کے وقت علوم الحدیث پڑھاتے تھے، میں نے شیخ سے ان کے گھنٹے میں سامع کی حیثیت سے شرکت کی اجازت طلب کی، انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ درخواست منظور فرمالی، اسی طرح میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ''کلیة التربیة''میں واقع ان کے دفتر میں فارغ اور مناسب وقت میں استفادہ کے لیے مجھے حاضری کی اجازت مرحمت فرمائیں! انہوں نے یہ درخواست بھی منظور فرمالی، چنانچہ احقر کی ایک خوش قسمتی یہ رہی کہ شام کے وقت شیخ کے ایک گھنٹے میں سامع کی حیثیت سے شریک ہوجاتا اور دوسری خوش قسمتی یہ کہ ان کے دفتر میں ان کی اجازت سے مناسب وقت میں استفادہ کے لیے حاضر ہوجاتا، اور جب شیخ جامعہ کی مرکزی لائبریری میں مطالعہ کے لیے کبھی تشریف لے جاتے تو ایک خادم کی حیثیت سے بعض دفعہ احقر کو ان کے ساتھ لائبریری جانے کا موقع بھی مل جاتا، جہاں شیخ کے لیے مطلوبہ کتابوں کو تلاش کرنے کی سعادت مجھے نصیب ہوتی اور ان سے سیکھنے اور استفادہ کرنے کا خصوصی موقع مل جاتا، یہ سلسلہ تقریباً دو سال (۱۴۰۸ھ - ۱۴۰۹ھ) تک جاری رہا، اس دوران حضرت شیخ ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ کو قریب سے دیکھنے اور ان کے علمی وعملی کمالات مشاہدہ کرنے کا موقع ملا، ان کی علمی

خصوصیتوں اور سیرت و کردار کی بلندیوں کا مفصل تذکرہ نہ تو میرے بس میں ہے اور نہ ہی اس مختصر مضمون میں ان تمام خوبیوں کو سمویا جاسکتا ہے، تاہم اپنے قلبِ حزیں کی تسکین اور قارئین کے فائدے کے لیے ان کے علمی و عملی کمالات کے چند نمونے سپردِ قلم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

علومِ دینیہ کے سچّے متلاشی

حضرت علّامہ شیخ عبدالفتّاح ابو غُدّہ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ایک سچّے طلبگارِ علم رہے، انہوں نے علمی ذخائر اور اہلِ علم کی تلاش میں اپنے ملک شام کے علاوہ حجاز، مصر، عراق، یمن، سوڈان، المغرب، ترکیہ، ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک کے دورے کیے اور بڑے بڑے اہلِ علم و اصحابِ تحقیق سے صرف استفادہ نہیں کیا، بلکہ ان کے علوم و تحقیقات کو اپنے اندر جذب کرلیا اور وہاں کے بڑے بڑے کتب خانوں اور لائبریریوں سے خوب استفادہ کیا، اور پھر مسلسل کتب بینی، تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور علم و تحقیق کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود ان کی علمی پیاس نے کبھی بجھنے کا نام نہیں لیا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی علمی پیاس میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا رہا تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ذیل میں ان کی زندگی کے مختلف واقعات میں سے صرف چار ایسے واقعات نمونے کے طور پر درج کیے جارہے ہیں، جن سے طلبِ علم کے لیے ان کی محنت، علمی وسائل تلاش کرنے کے لیے ان کی قربانی اور اس راستے میں ان کی جفاکشی کا ایک اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

پہلا واقعہ

جب حضرت شیخ ابو غدّہ ''كلية الشريعة جامع ازهر'' کے طالب علم تھے، اس زمانے میں ان کے محترم استاذ حضرت علّامہ محمد زاہد کوثری حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی: ۱۳۷۱ھ) نے ان کو ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''فتح باب العناية بشرح كتاب النُّقاية'' پڑھنے اور اپنے پاس رکھنے کی تاکید فرمائی تھی، کتاب چونکہ نایاب ہوگئی تھی، اس لیے شیخ ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تلاش میں طویل محنت اور دعائیں کیں، بالآخر ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اپنی منفرد تحقیق کے ساتھ اس کی پہلی جلد شائع کردی، دوسری جلد کا کام جاری تھا کہ شیخ کا انتقال ہوا اور اب ان کے ہونہار صاحبزادے شیخ سلمان ابو غدّہ حفظہ اللہ اس کی تکمیل میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیق کے مقدمہ میں مذکورہ ناپید کتاب تک پہنچنے کا جو عبرت انگیز واقعہ ذکر کیا ہے، اس کا ترجمہ و مفہوم پیش کیا جا رہا ہے:

> ''جب میں ''كلية الشريعة - جامع ازهر'' کا طالبِ علم اور قاہرہ میں مقیم تھا تو ہمارے استاذ حضرت علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی وابستگی رہی، اس دوران انہوں نے ایک دفعہ مجھے تاکید فرمائی تھی کہ میں علامہ ملّا علی قاریؒ کی کتاب ''فتح باب العناية بشرح كتاب النقاية'' کو تلاش کر کے اپنے پاس استفادہ کے لیے رکھوں، میرے استاذ کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ میں نایاب اور مفید کتابوں کا دلدادہ ہوں، اس لیے مجھے مذکورہ کتاب تلاش کرنے کا حکم دیا، میرا خیال یہ تھا کہ مذکورہ کتاب ہندوستان کی چھپی ہوئی ہوگی، اور قاہرہ میں چھ سال قیام کے دوران برابر اس کو تلاش کرتا رہا اور اپنی تعلیم کی تکمیل تک جس

کتب خانہ میں بھی کچھ اندازہ ہوجاتا کہ شاید یہاں پر موجود ہو' وہاں اُسے ڈھونڈتا رہا، لیکن اس کا کوئی اتا پتا نہیں چل سکا۔

اور جب قاہرہ سے اپنے وطن حلَب لوٹا تو جس شہر میں بھی جانا ہوتا یا جس کتب خانہ کی زیارت ہوتی میں برابر مذکورہ کتاب کو تلاش کرتا اور چونکہ مذکورہ کتاب کا تعلّق فقہ حنفی سے تھا، اس لیے میرا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی چھپی ہوئی ہوگی اور کتاب فروشوں سے اس امید پر ہندوستان کی چھپی ہوئی فقہ حنفی کی عام کتابوں سے متعلق پوچھتا رہتا کہ ہوسکتا ہے اپنی مطلوبہ کتاب ان کے ضمن میں مل سکے، اس لیے کہ بعض مرتبہ کتاب فروشوں کو کتاب کا نام یاد نہیں رہتا، اور دمشق کے کتاب فروشوں میں سے کچھ پرانے حضرات ایسے بھی تھے جو پرانی اور عمدہ کتابوں سے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے اور خود ان کے پاس بھی ایسی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ موجود تھا، البتہ ان کو بیچنے میں سختی سے کام لیتے تھے اور کافی مہنگے داموں فروخت کرتے تھے، اُن حضرات میں سے سیّد عزّت القُصَیباتی اور ان کے والد، اور شیخ حمدی السَّفَرجلَانی اور سید احمد عُبید بھی تھے۔

میں نے سید عزّت القُصَیباتی سے ''فتح باب العناية'' سے متعلق یہ کہہ کر دریافت کیا کہ ہندوستان کی چھپی ہوئی کتاب ہے، انہوں نے کہا کہ ہاں ! میرے پاس موجود ہے اور مذکورہ کتاب کے بجائے علّامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''البناية بشرح الهداية'' جو چھ ضخیم جلدوں میں تقریباً سو سال پہلے ۱۲۹۳ھ کی چھپی ہوئی تھی' نکال کر پیش کردی۔ میں نے اس کتاب کا نام اگرچہ نہیں لیا تھا، تاہم یہ بھی ان نایاب اور عمدہ کتابوں میں سے ایک تھی جن کو میں تلاش کررہا تھا، لہٰذا میں نے مناسب قیمت پر یہ کتاب ان سے خرید لی اور انہوں نے زیادہ قیمت اس لیے وصول نہیں کی کہ میں نے اس کتاب کا نام تو نہیں لیا تھا۔ پھر میں نے شیخ حَمدی السَّفَرجلانی رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب کے بارہ میں معلوم کیا تو

انہوں نے کہا کہ یہ روس کے ایک شہر قزان کی چھپی ہوئی ہے اور کبریتِ احمر سے زیادہ ناپید ہے، اور اپنی پوری زندگی اور کتابوں کے مشغلہ سے وابستہ ہونے کے دور میں صرف ایک نسخہ میرے ہاتھ آیا تھا جو میں نے علّامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کو اتنے اونچے داموں بیچا کہ تصور سے بالاتر ہے، ان کی اس بات سے یہ تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ کس شہر کی چھپی ہوئی کتاب ہے، البتہ ساتھ ساتھ اس کے دستیاب ہونے کی امید بھی کمزور ہوگئی۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ۱۳۷۶ھ کو پہلی بار اپنے بیتِ کریم کے حج کا موقع نصیب فرمایا اور میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو اس امید پر وہاں کے کتب خانوں میں مذکورہ کتاب کو تلاش کرتا رہا کہ شاید روس سے بلد اللہ الحرام کی طرف ہجرت کرنے والوں کے ساتھ یہ کتاب بھی پہنچ گئی ہو، لیکن مجھے کامیابی نہ مل سکی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عنایت نے مکہ مکرمہ کے چند معمولی بازاروں میں سے ایک بازار کے اندر ایک گوشہ نشین بزرگ کتب فروش تک مجھے پہنچایا جن کا نام تھا شیخ مصطفی بن محمد شنقیطی سلّمہ اللہ تعالیٰ، میں نے ان سے کچھ کتابیں خریدلیں اور ناامیدی کی کیفیت میں میری مطلوبہ کتاب کے بارہ میں بھی ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ: تقریباً ایک ہفتہ پہلے میرے پاس اس کا ایک نسخہ آیا تھا جو میں نے علماء بخارا میں سے ایک شخص کے ترکہ سے خریدا تھا اور پھر تاشقند کے ایک عالم کو اچھی خاصی قیمت پر بیچ دیا، مجھے پورا یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ میری مطلوبہ کتاب ہوگی، لیکن جب انہوں نے کتاب کی پوری کیفیت بیان کی تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی کتاب ہے جس کے حصول کے لیے میں چکّر پر چکّر کاٹ رہا ہوں اور عرصہ سے اس کی تلاش میں ہوں۔

میں نے ان سے کہا کہ وہ تاشقندی عالم کون تھے جنہوں نے کتاب خریدی؟ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بتانے لگے کہ ان کا نام شیخ عنایت اللہ تاشقندی تھا،

میں نے کہا کہ ان کی رہائش گاہ یا کام کرنے کی جگہ کہاں ہے؟ کہنے لگے: مجھے مزید کچھ بھی پتہ نہیں، میں نے کہا کہ میں انہیں کیسے تلاش کروں گا؟ انہوں نے کہا کہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس صورتحال سے کتاب یا اس کے خریدار ملنے کی نا امیدی میں اضافہ ہوا، لیکن پھر بھی میں جس بخاری شخص کو مسجدِ حرام یا مکہ کے بازاروں میں دیکھتا اس سے شیخ عنایت اللہ کا پوچھتا، اور جن مدارس یا رباطات سے متعلق مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں بخاری حضرات قیام پذیر ہیں وہاں جا کر مذکورہ بخاری شیخ کو تلاش کرتا، یہاں تک کہ مکّہ سے باہر جو محلّے واقع تھے اور مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں پر بخاری حضرات رہتے ہیں' وہاں بھی جا کر پوچھتا، لیکن مطلوبہ شخص کا ملنا دشوار تر ہوگیا، اگرچہ مکہ مکرمہ میں عنایت اللہ نام کے بہت سارے دوسرے حضرات رہتے تھے۔

میری مسلسل تلاش نے آخر میں مجھے شیخ عبدالقادر تاشقندی بخاری ساعاتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچایا جو مکّہ کے کنارے میں واقع محلّہ جَرْوَل میں قیام پذیر تھے، میں نے ان سے مطلوبہ تاشقندی شیخ کے بارہ میں معلوم کیا تو انہوں نے ان کو پہچانا اور ان کا صحیح نام ''شیخ میر عنایت تاشقندی'' بتایا، لیکن ان کی قیام گاہ یا ملنے کی جگہ سے چونکہ وہ لاعلم تھے اس لیے مجھ پر ایک مایوسی کی کیفیت چھا گئی اور جس شیخ کے پاس سے ''فتح باب العناية'' ملنے کی توقع کی جارہی تھی، ان سے ملاقات کی امید بظاہر دم توڑ گئی! اس کے بعد میں نے کعبہ معظّمہ زادہا اللہ تشریفاً و تعظیماً کے اردگرد طواف کے دوران اللہ تعالیٰ سے یہ مانگنا شروع کیا کہ مجھے اس مطلوبہ شخص سے ملادیں اور میرے لیے اس کتاب کا حصول آسان فرمادیں، اور دعا مانگنے کا یہ سلسلہ ایک ہفتہ تک برابر جاری رکھا اور اللہ جانتا ہے کہ میرا یہ ہفتہ اس کیفیت میں گزرا کہ میرا دل مذکورہ کتاب اور اس کے مالک کی تلاش میں پریشان تھا۔

مذکورہ کیفیت کے ساتھ میں ایک دن بازار ''بابِ زیادۃ'' میں چل رہا تھا (بابِ زیادۃ مسجدِ حرام کی توسیع سے پہلے اس کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کا نام تھا) اس دوران مکہ مکرمہ کے ایک پرانے دمشقی تاجر نے مجھے دیکھا جن کو ابوعَرَب کہا جاتا تھا اور مکہ مکرمہ میں ان کی تجارت گاہ تھی، انہوں نے مجھے شامی ہیئت و لباس میں دیکھ کر اپنے یہاں بلایا اور شام اور شام والوں کے احوال معلوم کرنے لگے، میں نے اپنی مطلوبہ کتاب سے شدّتِ محبت کے تحت ان سے مذکورہ بخاری شیخ کے بارہ میں پوچھا، حالانکہ یہ تو خود دمشقی تاجر تھے! انہوں نے کہا کہ سامنے والی دکان ان کے داماد کی ہے اور وہ سب سے زیادہ ان سے واقف ہیں، اللہ کی قسم! میں زیادہ خوشی کی وجہ سے ان کی تصدیق نہیں کر پا رہا تھا۔

بہر صورت! میں ان کے داماد کے پاس گیا اور ان سے شیخ عنایت کا پوچھا، وہ حیران ہو کر کہنے لگے کہ: ان کو تلاش کرنے اور ان سے ملنے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آگئی؟ میں نے کہا کہ مکہ مکرمہ میں میرا ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ میں ان کو برابر ڈھونڈ رہا ہوں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آپ اس سلسلہ میں میری راہنمائی کیجئے، انہوں نے ''حیّ المِسفلة'' میں واقع ان کی رہائش گاہ کی پوری نشاندہی کر دی جو کہ ''قهوة السقيفة'' کے بغل میں واقع تھی، میں بار بار دن رات ان کے گھر جاتا رہا، یہاں تک کہ ان سے ملاقات ہوگئی اور وہ اپنی من پسند قیمت پر کتاب دینے کے لیے آمادہ ہو گئے، پس یہ میری زندگی کی خوشیوں میں سے ایک اہم خوشی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب کی جلد اول کی تحقیق و اشاعت کی توفیق عطا فرمادی، اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ اپنے فضل و کرم سے باقی حصہ کی اشاعت کی توفیق بھی عنایت فرمادیں۔''

(مقدمہ تحقیق فتح باب العنایۃ، ص:۸-۹۔ صَفَحات من صبر العلماء، ص:۲۷۹-۲۸۱)

دوسرا واقعہ

علّامہ شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت علّامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی: ۱۳۵۲ھ) کی کتاب ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' کی تلاش تھی! کتاب چونکہ نایاب ہوگئی تھی، شیخ نے اس کی تلاش پندرہ سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رکھی، آخر میں ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر اپنی منفرد تحقیق کے ساتھ اس کو شائع کردیا۔ شیخ نے تحقیق کے مقدمہ میں مذکورہ کتاب کو تلاش کرنے کا جو واقعہ لکھا ہے، اس کا مفہوم اردو زبان میں پیش کیا جا رہا ہے:

''جو کتاب میں نذرِ قارئین کر رہا ہوں وہ میری زندگی کی قیمتی تمنا تھی، لیکن اس کا حصول میرے لیے کافی مشکل ہوگیا تھا، اس کا صرف ایک نسخہ حاصل کرنے کے لیے میں نے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ تک تلاش جاری رکھی، لیکن پھر بھی کامیابی نہ مل سکی، کتابوں کے شہر ''مصر'' میں چھ سالہ قیام کے دوران وہاں کے کتب خانوں میں برابر اس کو ڈھونڈتا رہا، اس کے بعد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں اس کی تلاش جاری رکھی، لیکن پھر بھی نہ مل سکی، پھر ہندوستان و پاکستان کے بعض بڑے اہل علم سے درخواست کی کہ یہ کتاب چونکہ ہندوستان کی چھپی ہوئی ہے، اس لیے آپ حضرات اس کا ایک نسخہ تلاش فرمالیں! میں اس بات پر تو ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کتاب کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی، البتہ وہ پھر بھی دستیاب نہ ہوسکی، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد اور پھر ایک جلیل القدر شخصیت کی تالیف تھی، اس لیے جیسے ہی ۱۳۴۴ھ کو پہلی بار دہلی میں شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگئی اور بعد میں اس کا ایک نسخہ بھی ملنا مشکل ہوگیا۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ہندوستان و پاکستان کے سفر کا موقع عنایت فرمایا اور

وہاں کے کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوئی تو میں نے وہاں پر بھی اس کی بڑی تلاش کی، لیکن کامیابی نہیں ملی، البتہ جب میں ہندوستان و پاکستان کے اس سفر کی آخری فرودگاہ کراچی پہنچا اور ہمارے جلیل القدر استاذ، محقق کامل، مفتی اعظم علّامہ محمد شفیع صاحب بانی دارالعلوم کراچی کی زیارت کا موقع ملا تو میرے اوپر ان کے احسانات میں سے ایک خصوصی احسان یہ رہا کہ انہوں نے اس کتاب کا اپنا مخصوص نسخہ ایک معزّز و نایاب ہدیہ کے طور پر مجھے عنایت فرمایا، یہ علمی ہدیہ میری واپسی سے صرف ایک دن قبل بروز ہفتہ ۷/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۸۲ھ کو انہوں نے اس امید کے ساتھ مجھے عنایت فرمایا کہ یہ کتاب بلادِ عرب میں شائع ہوجائے، میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور اس ہدیہ کی تعریف وقدردانی کرتے ہوئے اسے قبول کیا، البتہ اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں اس کی ورق گردانی کروں، اس لیے کہ اگلے دن بروز اتوار ۸/ جمادیٰ الاولیٰ کو صبح سویرے مجھے سفر کرنا تھا اور تیاری میں لگا ہوا تھا، لہٰذا یہ ارادہ کیا کہ ''سوریہ'' جاتے ہوئے ہوائی جہاز کے اندر اس کو رفیقِ سفر بناؤں گا۔

صبح جب میں اپنے ملک واپسی کے لیے کراچی ائیرپورٹ پہنچا تو وہاں پر اہلِ علم و فضل کی ایک جماعت کو موجود پایا جو اس عاجز و ناتواں کو اکرام کے ساتھ رخصت کرنے اور اس کو اپنی آخری اور قیمتی ملاقات سے نوازنے کے لیے جمع تھی، جہاز اُڑنے کے مقرّرہ وقت سے کچھ پہلے اعلان ہوا کہ جہاز دو گھنٹے لیٹ ہے تو میں نے ان علمائے کرام سے درخواست کی کہ آپ حضرات اپنی مصروفیات کی انجام دہی کے لیے واپس تشریف لے جائیں، لیکن انہوں نے احقر کو رخصت کرنے اور مزید عنایت سے نوازنے کے لیے آخری لمحہ تک انتظار کرنے پر اصرار فرمایا، چونکہ یہ مہلت کا ایک بہترین موقع تھا، اس لیے ہم ائیرپورٹ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے، اور چونکہ ان علمائے کرام کے ساتھ ان کے شاگردوں اور مخلصین کا بھی

ایک جمّ غفیر موجود تھا، اس لیے ہماری اس الوداعی ملاقات نے ایک بڑی علمی مجلس کی صورت اختیار کرلی، جس میں چیدہ چیدہ علمائے کرام شریک تھے، ان علمائے کرام میں سرفہرست ہمارے جلیل القدر استاذ مولانا علّامہ محمد شفیع صاحب اور ہمارے بے مثال وکرم فرما استاذ مولانا علّامہ محمد یوسف بنوری صاحب بانی مدرسہ اسلامیہ کراچی اور اسی مدرسہ کے جلیل القدر مدرّس مولانا علّامہ لطف اللہ صاحب اور مدرسہ دارالعلوم کراچی کے ناظم مولانا علّامہ نور احمد صاحب اور دیگر اہلِ علم تھے، جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔

میں نے چاہا کہ بہتر یہ ہوگا کہ فرصت کے ان لمحات کو قیمتی بنا کر ماہ تابِ علم وکمال حضرات سے استفادہ کرنے میں خرچ کیا جائے، اس مقصد کے تحت میں نے مذکورہ کتاب ''التصریح بماتو اتر فی نزول المسیح'' نکال کر ان علمائے کرام سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس کے ایک حصہ کی عبارت آپ کے سامنے پڑھنا چاہتا ہوں! انہوں نے میری اس خواہش کو سراہا، پھر میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ مجھے عبارت پڑھنے سے پہلے اس کتاب کی اجازت مرحمت فرمائیں! انہوں نے خوشی کے ساتھ اجازت مرحمت فرمادی۔ میں نے حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کا پورا مقدمہ اور کتاب کی تین حدیثیں پڑھیں، پھر ہمارے استاذ مجمع الفضائل والعلوم حضرت علّامہ محمد یوسف بنوری حفظہ اللہ تعالیٰ نے مزید پانچ حدیثیں پڑھیں اور اس دوران علمائے کرام کے درمیان علمی نکات پر تبادلۂ خیال بھی کیا جاتا رہا۔

جب میری روانگی کا وقت قریب ہوا تو میں نے اس وقت وہ دوشعر سنا دیے جو دولتِ عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام اور ہمارے استاذ شیخ مصطفی صبری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مصر سے اپنے ملک واپسی کے لیے رخصت کرتے وقت سنائے تھے:

قالتْ ومدَّتْ يداً نحوي تُودِّعُني ۔۔۔ ولَوْعةُ البَيْن تأبى أن تمدَّ يداً

أَ ميِّت أنْتَ أمْ حيٌّ؟ فقلتُ لا ۔۔۔ من لم يمت يومَ بَيْنٍ لم يمت أبداً

ترجمہ و مفہوم

"اس نے رخصت لینے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیئے، لیکن جدائی کا غم مجھے ہاتھ بڑھانے سے منع کر رہا تھا، کہنے لگی کہ: کیا تو مردہ ہے یا زندہ؟ میں نے جواب میں کہا کہ: جو جدائی کے دن بھی نہیں مرا، وہ پھر کبھی نہیں مرتا۔"

اس پر ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے مندرجہ ذیل دو شعر سنائے (جن میں فراق کے زمانہ میں ایامِ وصال کو یاد کرنے اور ان پر غمگین ہو کر رونے اور رُلانے کا تذکرہ ہے)

تذكَّرَ عهداً بالحِمىٰ ثمّ معهداً　　جرىٰ فيه من دَورِالكؤوس تَسَلْسُل
بَكَيْنا فَأَبْكَينا ولامثلَ ناقفٍ　　لحنظلة فِي الحيِّ حين تحمّلُوا

اس دوران حضرت بنوریؒ اور میری حالت (رونے کی کیفیت میں) مندرجہ ذیل شعر کے مطابق رہی:

ويَبْكِيْ فَأَبْكِيْ رحمةً لبكائه　　إِذا ما بكٰى دمعاً بكيتُ له دماً

ترجمہ و مفہوم

"وہ رو رہا ہے تو میں بھی اس کے رونے پر رحم کھاتے ہوئے روتا ہوں، جب وہ آنسو بہاتا ہے تو میں اس کے لیے خون کا آنسو بہانے لگتا ہوں۔"

اس کے بعد رخصت اور جدائی کا وقت آیا اور میرے دل میں یہ پکا ارادہ تھا کہ اپنے شیخ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کی اس تمنا پر لبیک کہوں گا کہ یہ عظیم کتاب شائع ہونی چاہیے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و مدد سے سالِ رواں ۱۳۸۵ھ کو مذکورہ کتاب کی تحقیق و خدمت کا ایسا موقع عنایت فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اس سے اہلِ علم کی

آنکھیں ٹھنڈی اور ایمان والوں کے قلوب منور ہوں گے، اور درست عقیدہ والوں اور سچّے مسلمانوں کے اذہان بصیرت حاصل کریں گے، اور یہ بھی امید ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو محنت وصبر وباریک بینی سے کام لیا ہے، وہ اس اللہ کے یہاں میرے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا جو احسانات بکھیرنے والا اور عطایا بخشنے والا ہے، اور جو پڑھنے والے اس کتاب میں کوئی فائدہ محسوس فرمائیں گے ان سے امید کرتا ہوں کہ مجھے ایسی نیک دعا میں یاد فرمالیں جس پر فرشتے آمین کہیں اور دعا کرنے والے کو بھی برابر کا ثواب ملے۔''

(مقدمۂ تحقیق ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیحؑ''، ص ۳-۵)

تیسرا واقعہ

حضرت شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۸۲ھ کو جب علمائے کرام اور دینی مراکز کی زیارت کے لیے ہندوستان و پاکستان کا دورہ کیا، اس دوران جامعہ اشرفیہ لاہور بھی تشریف لے گئے، اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور دیگر علمائے کرام سے ملاقاتیں کیں، ان ملاقاتوں کے دوران شیخ نے جو علمی فوائد حاصل کرلیے ان میں سے نمونہ کے طور پر صرف ایک مختصر علمی نکتہ جو انہوں نے حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا آگے قلمبند کیا جارہا ہے، تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ شیخ علمی فوائد کے کتنے دلدادہ اور قدردان تھے! اُس علمی نکتہ کا تذکرہ خود شیخ کی زبانی سنئے:

''حضرت مولانا ادریس کاندھلوی نے اس ملاقات کے دوران یہ بتایا کہ انہوں نے اپنے استاذ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ

انہوں نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شہادت فی سبیل اللہ کی آرزو پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی تمنّائے شہادت تو کبھی پوری نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو ''سیف اللہ'' کے لقب سے نوازا تھا اور اللہ کی تلوار کو نہ کوئی توڑ سکتا ہے اور نہ ہی سیف اللہ کو کوئی قتل کرسکتا ہے، لہٰذا ان کی شہادت کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔ میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی حفظہ اللہ سے عرض کیا کہ میرے سفر کی قیمت اس ایک علمی نکتہ کے ذریعہ وصول ہوگئی، اس لیے کہ صرف یہی ایک علمی نکتہ ایک مستقل سفر کا حق دار ہے۔''

(حاشیۃ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، ص: ۲۱۲)

چوتھا واقعہ

حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مایۂ ناز کتاب ''صَفَحاتٌ من صبر العلماء'' میں زمانۂ طالب علمی کا اپنا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ وہ ابتداء ہی سے طلبِ علم کی خاطر کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے، واقعہ کا اُردو ترجمہ ومفہوم پیش کیا جارہا ہے:

''میں بھی عام طلبہ کی طرح طالب علمی کے زمانہ میں تنگدستی کا شکار رہا، تاہم اپنے معمولی خرچہ میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر حسبِ استطاعت نقد یا ادھار پر کتابیں خرید لیتا، ایک دن کچھ ایسی نایاب واہم کتابیں میرے سامنے فروخت کے لیے پیش ہوئیں جنہیں میں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، لیکن زیادہ تنگدستی کی وجہ سے خریدنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا! جس کی وجہ سے میں تشویش میں مبتلا ہوگیا، پھر میں نے اُون کی بنی ہوئی اپنی ایک خوبصورت چادر جو مجھے اپنے

والد سے وراثت میں ملی تھی ''سوق الحراج'' (ایک بازار کا نام ہے) میں بیچ کر مذکورہ کتابیں خرید لیں اور اپنے دل کو مطمئن کر دیا، ان کتابوں کے خریدنے اور اپنے پاس رکھنے سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ الحمدللہ! وہ قیمتی چادر پھر یاد بھی نہیں رہی۔'' (صَفَحات من صبر العلماء، ص:۲۷۸-۲۷۹)

احقر کہتا ہے کہ مذکورہ چار واقعات شیخ عبدالفتاح ابو غُدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی زندگی کے بے شمار حیرت انگیز واقعات میں سے چند ہی ہیں، جو نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اور جن سے شیخ کے جذبات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کے ایسے ہی واقعات و جذبات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مشہور مقولہ کو صرف پڑھا ہی نہیں تھا، بلکہ عملی میدان میں اس کا پورا حق ادا کر دیا تھا: ''العلم لا يُعطيكَ بعضَه حتى تعطيه كلَّك'' (علم اپنا ایک حصہ بھی اس وقت تک آپ کو نہیں دیتا جب تک آپ اپنا سب کچھ اس کو نہیں دیتے) اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے ہی جذبات کی بدولت شیخ نے ''صَفَحات من صبر العلماء على شدائد العلم والتحصيل'' اور ''قيمة الزمن عند العلماء'' جیسی مقبول ترین کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء و مشائخ سے بے پناہ محبت و عقیدت

شیخ عبدالفتاح ابو غُدّہ رحمۃ اللہ علیہ کو علمائے ہند سے بالعموم اور مشائخ دارالعلوم دیوبند سے بالخصوص بے پناہ محبت و عقیدت تھی، اسی عقیدت کے تحت انہوں نے ۱۳۸۲ھ کو ہندوستان و پاکستان کا ایک طویل سفر کیا جس کا مقصد علمائے کرام سے

ملاقاتیں، دینی مراکز کی زیارت اور وہاں کے کتب خانوں اور لائبریریوں سے استفادہ کرنا تھا، مذکورہ طویل سفر کے دوران شیخ نے ''فرنگی محل لکھنؤ'' میں حضرت مولانا عبد الحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۴ھ) کے خاندان کے علماء سے ملاقات کی اور حضرت مولانا عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وتالیفات سے متعلق ان سے دقیق معلومات حاصل کیں، اسی طرح حضرت علامہ ابو الوفاء افغانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۹۵ھ) رئیس ''مجلس احیاءِ معارفِ نعمانیہ حیدرآباد دکن'' کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان سے علمی استفادہ کیا، شیخ نے خود ''الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل'' کی تحقیق کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس سفر میں تیس ایسے شہروں کی زیارت کی جہاں بڑے اہلِ علم وکمال اور دینی مراکز موجود تھے۔

شیخ ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں ان تیس شہروں میں سے سب سے اہم اور سرفہرست شہر دیوبند اور اس کا دینی مرکز دارالعلوم دیوبند تھا، چنانچہ وہ خصوصی طور پر دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے مشائخ کی زیارت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے نظم ونسق اور علمی واصلاحی ماحول کو دیکھ کر بے حد متأثر ہوئے اور اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سبق میں شرکت بھی فرمائی۔ اس موقع پر شیخ نے دارالعلوم کے رجسٹر میں اپنے جن تأثرات کو قلمبند کیا ہے ان میں اس بات کو خاص طور پر اہمیت دی ہے کہ علمائے دیوبند کی اکثر تالیفات جو علوم ومعارف کے خزانے ہیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں اور عالَم عرب ان کے استفادہ سے محروم ہے، لہٰذا میری پرزور گزارش و درخواست ہے کہ ان کو عربی زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ حضرت شیخ ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ

کے تأثرات کا اردو ترجمہ تاریخ دار العلوم دیوبند سے نقل کیا جارہا ہے:

''اس عاجز و ناتواں راقم سطور کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل و انعام ہے کہ اس نے ہندوستان کے شہروں کی سیاحت و زیارت کا موقع بہم پہنچایا، بالخصوص ان شہروں میں سرفہرست دیوبند اور اس کی دینی درسگاہ ''دار العلوم'' کا درجہ ہے، جو درحقیقت ہندوستان کا علم وتقویٰ سے بھرپور زندہ قلب، علماء و مؤلفین کا مرکز اور دین و معرفت کے طلبہ کی آماجگاہ ہے، اس مرکز کی زیارت عمر بھر کی تمناؤں اور لیل و نہار کے خوابوں میں سے ایک خواب وتمنا تھی، خدا کا شکر ہے کہ آج دار العلوم کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

دور رہتے ہوئے جو کچھ دار العلوم کے بارے میں سنا تھا، اس کا جو کچھ ذہن میں خاکہ وتصور تھا قریب سے دیکھ کر اس کو اس سے کہیں زیادہ اچھا اور بہتر پایا، اس مقدس ادارے کے گوشے گوشے سے انوارِ علم کا فیضان ہوتا ہے، اس کی درسگاہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور تشنہ کارانِ علم اور طالبانِ رشد وہدایت کے لیے مثالی نظم ونسق، سلیقہ شعاری اور روشن دماغی کے ساتھ اس اسلوب سے احکام دین وشریعت بیان کیے جاتے ہیں، جس میں اہلِ روحانیت کی روحانیت، اور اصحابِ علم وتحقیق کے آثار وفیوض نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ کمالِ فضل واحسان ہے کہ مجھے مولانا الأجل بركة الأمة ذو الأنفاس الطاهرة سيدى الشيخ المحدث السيد فخرالدين أحمد المرادآبادی کے درسِ حدیث شریف کے کچھ حصہ کی سماعت کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت موصوف نے طلبۂ محبینِ کرام کی درخواست پر احقر کی رعایت کرتے ہوئے حدیث بنی سلمہ پر عربی میں تقریر فرمائی، جس میں ذکر ہے کہ بنی

سلمہ کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے مکانوں کو چھوڑ کر مسجدِ نبوی کے جوار میں منتقل ہوجائیں، رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو ارشاد فرمایا:

''دیارَکم تُکتب لکم آثارُکم۔''

موصوف کی تقریر بیش بہا موتیوں اور تابناک ستاروں کا مجموعہ اور''فیض الباری''اور''عمدۃ القاری'' کا مصداق تھی، اسی کے ساتھ شیخ موصوف کی طرف سے ان طلبہ کو جو گوش برآواز تھے اپنے خصوصی ارشادات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا جوان تلامذہ کے نفوس میں اس طرح سرایت کرتے تھے جس طرح عطر ہوا میں اور پانی زندگی میں کرتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو سنتِ مطہرہ اور اس کے متبعین کی طرف سے جزائے خیر دے اور اس ادارے کو سماحۃ الشیخ صدر المدرسین مولانا العلامۃ ابراہیم البلیاوی اور مولانا القاری محمد طیّب صاحب جیسے ارکان واساطین، ائمہ اجلہ، بدور الہدیٰ (بدر ہائے ہدایت) اور مصابیح دُجیٰ (شمعہائے ظلمت) کے زیرسایہ ہمیشہ پھلتا پھولتا قائم رکھے اور ان بزرگوں کے نفع بخش اوقات اور انفاسِ طاہرہ میں برکت عطا فرمائے۔

ذمہ دارانِ مدرسہ نے میرے ساتھ مزید احسان واکرام یہ کیا کہ احقر کو اپنا خصوصی مہمان بنایا، اس طرح بسہولت علمائے کرام سے علمی استفادے کا موقع ملا، فللّٰہ الحمد، نیز وہ چیز جس کے لیے آج ہم سب اللہ تعالیٰ کے مرہونِ منت اور احسان مند ہیں، وہ یہ ادارہ ہے جو مع اساتذہ وتلامذہ کے دین کا گھنا سایہ دار درخت، علم وتقویٰ کا مرکز اور جسمِ اسلامی کی بقاء کا ضامن وہ پھیپھڑا ہے جس میں حیاتِ روحانی کے آثار رواں دواں ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس ادارے کی بقا وترقی اور اس کے علماء کے طولِ حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے، واللّٰہ یجیب ولایخیّب رجاءَ الراجین فضلاً منه وکرماً۔

علم وتقویٰ کے اساطین سے مالا مال اس عظیم الشان ادارے کے علماء عظام کی خدماتِ جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے، جس کا مطالبہ کر رہا ہوں، وہ یہ کہ ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متفردانہ عقول کے نتائجِ فکر اور بیش بہا علمی فیوض وتحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علماء کے لیے استفادے کا موقع فراہم کریں، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لیے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اُس میں اُس کو وہ نئی متفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار علیہ گہرے علم اور وسیع مطالعہ کے علاوہ تقویٰ وصلاح اور روحانیت ہوتی ہے، اور چونکہ ہندوستان کے علماء وشیوخ کرام نیکی وصلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شرائط پر نہ صرف یہ کہ پورے اُترتے ہیں، بلکہ سلف صالحین کے صحیح وارث اور ان کے نمونے ہیں، اس لیے ان کی کتابیں نئی اور کارآمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں، وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء، بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر، مفسرین ومحدثین اور حکماء کے ہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی، لیکن عربی کو کثیر الاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے، ظاہر ہے کہ وہ اردو کو حاصل نہیں، لہٰذا یہ علوم اور بیش قیمت تحقیقات جو ہمارے برادرانِ اسلام علمائے ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں اگر اردو ہی کے قالب میں محبوس رکھی گئیں تو ہم عربی زبان بولنے والوں سے مخفی اور پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا باعث بنی رہیں گی۔ اس طرح نہ صرف ہمارے ساتھ ناانصافی ہوگی

بلکہ علم و دین کے حق کا بھی ایک بہت بڑا نقصان ہوگا، اس لیے فریضۂ معرفت اور امانتِ علم کی ادائیگی کے لیے یہ بات اوّلین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس، شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لیے بے تاب، تشنہ اور مشتاق ہیں اور جیسا کہ میرا خیال ہے اس اہم ذمّہ داری اور کٹھن فریضہ کی ادائیگی کا کام اسی ادارۂ عامرہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبۂ نجباء کا گہوارہ و سرچشمہ ہے۔

اس موقع پر جبکہ میں ذمّہ دارانِ ادارہ کے مشفقانہ طرزِ عمل، نوازشاتِ بزرگانہ اور طلبۂ عزیز کے جذباتِ محبّت واخوت کے لیے کلماتِ شکر حیطۂ تحریر میں لا رہا ہوں اپنے مذکورہ بالا حق اور مطالبے کو دُہرانے کی ایک بار پھر پُر امید ہوکر جرأت کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے کہ اگر ان حضرات نے اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف توجہ مبذول فرمائی تو اس طرح جہاں وہ اپنی ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہوں گے، ساتھ ہی ساتھ یہ دین وثقافت کی ایک عظیم الشان خدمت اور قابلِ ذکر کارنامہ ہوگا، کیونکہ یہ علوم دنیا کے تمام مسلمانوں ہی کی مِلک نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان مساوی طور پر اس سے استفادے کے مستحق ہیں، چہ جائیکہ صرف ہندوستان ہی کے مسلمان ان کے اجارہ دار قرار پائیں، اس لیے ازبس ضروری ہے کہ اُردو کتابوں کے عربی میں تراجم کیے جائیں، تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ ترویج واشاعت ہو، اور وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم کیے جاسکیں۔

مجھے یہ سُن کر کسی حد تک اطمینان اور مسرّت ہوئی کہ یہ اہم مسئلہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے زیرِ غور ہے، اور وہ عن قریب اس اہم بار اور ذمّہ داری کی ادائیگی کے لیے قدم اُٹھانے والی ہے، جو درحقیقت اس ادارے کے علماء کا اور بالخصوص طلبہ کا واجبی فرض ہے، میں اس خوشخبری کے بعد تمام علمائے اکابر کا ان

کے اس مُبارک عزم اور اقدام پر تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کارِ عظیم میں اس کی خصوصی مدد و معاونت ان کے شاملِ حال ہو، تاکہ بسہولت وہ اس فریضے کو مرحلۂ تکمیل تک پہنچا سکیں، باری تعالیٰ کے لیے یہ کوئی دشوار امر نہیں، وَمَاذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيْزٍ اور نہ ہی ان علمائے اماجد کے لیے ان کے پُختہ عزائم کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسا کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہے جو نا قابلِ عبور ہو۔''

(تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص: ۳۷۴-۳۷۸)

شیخ ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا تأثرات کا اظہار دارالعلوم دیوبند کی پہلی زیارت کے موقع پر کیا ہے، اس کے بعد بھی وہ کئی بار دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے ہیں اور وہاں کے ماحول میں آج تک ان کو بلند القاب واحترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

خوش اخلاقی وخاکساری میں یکتا

شیخ ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ خوش اخلاقی وخاکساری کے ایک بلند مقام پر فائز تھے۔ جس وقت احقر کو ان کی زیارت اور ان کی درسگاہ میں سامع کی حیثیت سے حاضری کا شرف میسّر رہا، اس وقت شیخ کی عمر ستّر سال سے کچھ اوپر ہو چکی تھی اور ان کے علوم وتصانیف کی شہرت عالمِ اسلام کے گوشے گوشے تک پھیل چکی تھی، لیکن اس کے باوجود ان کی کسی ادا سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی عُجب یا خود پسندی میں مبتلا ہیں، بلکہ ان کی گفتار و کردار سے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک ادنیٰ طالب علم تصور

کرتے ہیں، چنانچہ میں دیکھتا تھا کہ درسگاہ میں پڑھاتے وقت جب کوئی طالبِ علم ان سے سوال کرتا تو وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر طالب علم کے قریب آکر بہت ہی اہتمام و شفقت کے انداز میں اُسے سمجھا دیتے، اسی طرح میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ بعض مرتبہ شیخ مطالعہ کے لیے اپنے دفتر سے جامعہ کی لائبریری کی طرف پیدل نکلتے اور خادم کی حیثیت سے احقر بھی کبھی ساتھ ہوجاتا، تاکہ لائبریری میں ان کی مطلوبہ کتابوں کو تلاش کرنے اور ان کی میز تک پہنچانے کی سعادت مجھے میسّر رہے اور اس دوران ان سے استفادہ کرنے کا کچھ موقع بھی ملے، لائبریری کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں احقر یہ دیکھتا کہ جب سامنے سے آتے ہوئے کوئی طالب علم شیخ کو دیکھ کر ان سے مصافحہ کے لیے مڑنے کا ارادہ کرتا تو اس طالب علم کے مڑنے سے پہلے شیخ اس کی طرف مڑ جاتے اور ہاتھ بڑھا کر سلام و مصافحہ اور مزاج پرسی کرتے، میں اس منظر کو دیکھ کر محوِ حیرت ہوجاتا کہ اتنی مصروفیت اور بڑھاپے کے باوجود شیخ کے بلند اخلاق و تواضع کا کیا ٹھکانہ ہے! کوئی بھی ادنیٰ طالب علم جب مصافحہ کرنے کے لیے ان کی طرف مڑنے کا ارادہ کرتا ہے وہ خود مڑ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور سلام و مصافحہ کے ساتھ نہایت شفقت کے انداز میں مزاج پرسی بھی کرنے لگتے ہیں۔

شام کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے **فضیلۃ** الشیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ کے اخلاقِ فاضلہ اور صلاحیت و تقویٰ کو دیکھتے ہوئے مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مندرجہ ذیل وہ دُعا یاد آجاتی، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرزمین شام و یمن کی برکت کے لیے فرمائی تھی:

”عن ابن عمرعن النبي ﷺ قال: اللّٰهم بارك لنا في شامنا و في يمننا“ (رواه البخاري ،ج:۱،ص:۱۴۱)

اور یہ سوچتا کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورہ عمومی دُعا اور اس کی برکات میں سے ایک حصہ حضرت شیخ ابوغدّہ کو علمِ نافع، عملِ صالح اور بلند اخلاق کی صورت میں ملا ہے۔ شیخ ابوغدّہ اور شام سے تعلق رکھنے والے چند دیگر علمائے کرام کے علم وفضل، تقویٰ وطہارت اور تواضع و خاکساری کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اُس حدیث کی طرف بھی ذہن منتقل ہوجاتا جس میں سرزمینِ شام کے حق میں خوشحالی اور اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ اس پر اللہ کے فرشتوں نے اپنے پر بچھائے ہوئے ہیں:

”عن زيد بن ثابت رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: طوبٰى للشام ، قلنا: لأيّ ذٰلك يارسول الله؟ قال لأن ملائكة الرحمٰن باسطة أجنحتَها عليها“

(رواہ الترمذی، ج:۲،ص:۲۳۲)

تحقیقی ذوق اور صحیح الفاظ کے انتخاب میں مہارت وپختگی

شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کو عربی زبان کے مفردات اور اس کی نثر ونظم کا ایک بڑا سرمایہ محفوظ تھا، اسی طرح قواعدِ صرف ونحو اور مسائلِ فصاحت و بلاغت پر عبور حاصل تھا، وہ اپنے مضامین کے اندر مبہم، پیچیدہ یا ایسے الفاظ کو جگہ دینے کے روادار نہیں تھے جو غلط ہونے کے باوجود رواج پا گئے ہوں، اپنی تحریروں میں ان کی کوشش ہوتی کہ قاری کو کوئی دقت و پریشانی لاحق نہ ہونے دیں، وہ واضح الفاظ اور صاف ستھرے جملوں کو ترجیح دیتے، اور اگر ان کی تحریر میں کوئی ذرا سا مشتبہ یا

مشکل لفظ آجاتا تو اس پر اعراب وحرکات وسکنات ظاہر کردیتے، اسی طرح اگر کسی دوسرے مصنف کی کتاب میں کوئی مبہم لفظ ان کے سامنے آتا تو اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور جب تک اُسے حل نہ کر لیتے انہیں چین نہیں آتا۔

ان کے شاگردِ رشید اور علمی جانشین شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ نے ان کے تحقیقی ذوق سے متعلق ایک چشم دید واقعہ لکھا ہے، جس کا مفہوم وترجمہ پیش کیا جارہا ہے:

''ایک مرتبہ میں اپنے استاذ محترم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اپنی عادت کے مطابق مجھے اپنے مہمان خانے لے گئے، میں نے دیکھا کہ مہمان خانہ کی تمام کرسیوں میں سے جن کی تعداد اچھی خاصی تھی ایک بھی بیٹھنے کے لیے خالی نہیں، سب کے اوپر کتابیں رکھی ہوئی ہیں، میں نے ہنستے ہوئے ان سے عرض کیا کہ خیریت تو ہوگی ان شاء اللہ! (یہ کیا منظر دیکھ رہا ہوں؟) شیخ نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: اس کتاب کے اندر لفظ ''إ حالة'' حاء مہملہ کے ساتھ میرے سامنے آیا جس سے متعلق مصنف لکھتے ہیں کہ: امام شافعیؒ اس کے قائل ہیں، میرے سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ''إ حالة'' سے ان کی مراد کیا ہے؟ اور میں نے اِس لفظ کی تلاش میں تین مہینے محنت کی اور اپنے چند مشائخ سے بھی معلوم کیا، لیکن جواب نہیں ملا، پھر میں نے ان تمام کتابوں میں سے ایک ایک کو یہاں لاکر اس کے اندر اس لفظ کو تلاش کیا، بالآخر مسئلہ حل ہوگیا اور معلوم ہوا کہ یہ لفظ ''إحالة'' نہیں، بلکہ خاء معجمہ کے ساتھ ''خَالَ یخَالُ'' سے لیا گیا لفظ ''إخالة'' ہے بمعنی گمان کرنا، اور حضرات شوافع کے نزدیک اصول الفقہ کی کتابوں میں بابِ قیاس کے اندر علّت سمجھنے کا ایک طریقہ ''إخالة'' ہے۔''

(امداد الفتاح، ص: ۱۳۰)

اسی طرح شیخ محمد عوّامہ نے اپنے استاذِ گرامی سے متعلق ایک دوسرا واقعہ اس طرح لکھا ہے:

''جب ہم مرحلہ ثانویہ کے سالِ اول کے طالبِ علم تھے تو ہمارے استاذ (شیخ امین اللہ عیروض رحمۃ اللہ علیہ) نے واقعہ بیان کیا کہ وہ چند ساتھیوں سمیت جن میں شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ بھی شامل تھے دمشق گئے اور ایک عالم کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اس دوران ایک لفظ کے تلفُّظ یا مفہوم میں (جو مجھے یاد نہیں رہا) شرکائے حلقہ کو اشکال پیش آیا، مدرّس صاحب نے ایک طالب علم کو ''القاموس المحیط'' لانے کا حکم دے دیا تو ہمارے استاذ جنہوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے ان سے کہنے لگے کہ قاموس لانے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہاں پر بولتا ہوا قاموس شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ موجود ہیں، آپ لوگ جو چاہیں ان سے دریافت کرلیں''۔

(امداد الفتاح، ص: ۱۲۲)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ شیخ عبدالفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ غلط لفظ کو ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے اور طلبہ کو بھی اس کے استعمال سے روکتے تھے، اور سبق کے دوران اہتمام کے ساتھ ایسے الفاظ کی نشاندہی کرتے جو غلط ہونے کے باوجود زباں زد ہوچکے ہُوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ''جامعة الملك سعود'' میں علوم الحدیث پڑھانے کے لیے جب شیخ درس گاہ تشریف لائے تو تخریجِ احادیث کے طریقے بتاتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''التلخيص الحبير فی تخريج أحاديث الرافعی الكبير'' کا ذکر فرمایا، اور اس مناسبت سے کہا کہ بعض لوگ اس کتاب کو الف لام کے بغیر مضاف ومضاف الیہ سمجھ کر ''تلخيص الحبير'' کے نام سے یاد کرتے ہیں جو کہ غلط ہے، اس لیے کہ یہ موصوف وصفت ہے اور صحیح لفظ الف لام کے ساتھ ''التلخيص الحبير'' ہے، اور افسوس ہے کہ بیروت کے بعض اشاعتی اداروں نے بھی مذکورہ کتاب کا نام اس کی جلد پر غلط شائع کیا ہے، پھر شیخ نے تختۂ سیاہ پر (نوٹ) لکھ کر اس کے نیچے مذکورہ بالا تحقیق کا خلاصہ لکھا اور طلبہ کو اپنی کاپیوں میں نقل کرنے کا حکم دے دیا۔

شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مزید کچھ عرصہ تک رہنے کی تمنا و کوشش

احقر نے ''جامعة الملك سعود'' میں دو سال (۱۴۰۸ھ-۱۴۰۹ھ) گزار کر شعبہ ''معهد اللغة العربية'' کے آخری کورس ''إعداد المعلّمين'' سے بھی فراغت حاصل کر لی، اس کے بعد قانونی طور پر میں ''جامعة الملك سعود'' میں مزید قیام نہیں کر سکتا تھا۔ اُدھر دار العلوم دیو بند کی تدریسی خدمت سے بھی مجھے صرف دو سال کی چھٹی ملی تھی جس کی مدت پوری ہو گئی تھی، لیکن دل یہ چاہ رہا تھا کہ فضیلۃ الشیخ عبد الفتاح ابو غدّہ کی خدمت میں مزید کچھ عرصہ تک رہنے کا موقع ملے، تا کہ صرف سامع کی حیثیت سے نہیں بلکہ باضابطہ طور پر ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر ان سے استفادہ کر سکوں، میں نے اپنی اس آرزو کا اظہار جب شیخ ابو غدّہ سے کیا تو انہوں نے اس کی تائید فرمائی، اور ان ہی کے مشورہ سے میں نے اگلے تعلیمی سال ۱۴۱۰ھ کے لیے ''كلية التربية'' کے شعبہ ''الثقافة الاسلامية-تخصص فى التفسير والحديث'' مرحلہ ایم-اے میں داخلہ لینے کی درخواست پیش کر دی۔ مذکورہ مرحلہ میں غیر ملکیوں کا داخلہ تقریباً ممنوع تھا، لیکن احقر کی درخواست کو اس وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ احقر نے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اپنے بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے شعبہ ''معهد اللغة العربية'' میں اعلیٰ اور امتیازی نمبرات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ طالبِ مثالی کی سند اور پورے جامعہ کی سطح پر چار سونے کے تمغے (گولڈ میڈل) بھی حاصل کر لیے تھے، چنانچہ میری درخواست کارروائی کے لیے منظور ہو گئی اور جامعہ کے نظام کے مطابق پانچ پروفیسروں پر مشتمل کمیٹی نے میرا انٹرویو لیا، کمیٹی میں محترم

ڈاکٹر نعمان السامرّائی، محترم ڈاکٹر احمد جلبی، محترم ڈاکٹر حسین الترتوری، محترم ڈاکٹر شاکر فیّاض، محترم ڈاکٹر عبد الرحمن المطر ودی شامل تھے۔ انٹرویو میں پانچ چیزیں پیش نظر تھیں: نمبر ایک یہ کہ طالب کی سابقہ سند کس حیثیت کی حامل ہے؟ نمبر دو یہ کہ تفسیر وحدیث میں اس کی صلاحیت کیسی ہے؟ نمبر تین یہ کہ معلوماتِ عامّہ میں اس کی قابلیّت کتنی ہے؟ نمبر چار یہ کہ طالبِ علم کی شخصیت کیسی ہے؟ نمبر پانچ یہ کہ عربی زبان میں اس کی صلاحیت کیسی ہے؟۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انٹرویو میں کامیابی ہوئی اور مذکورہ پانچوں امور میں سے ہر ایک کے سامنے بالترتیب ''ممتاز'' لکھا گیا اور آخر میں یہ لکھا گیا کہ مقرّرہ کمیٹی مذکورہ طالب علم کے داخلہ کی سفارش کرتی ہے اور پھر پانچوں پروفیسر حضرات نے دستخط کردیئے، اس انٹرویو کی بنیاد پر ''كلية التربية - قسم الثقافة الإسلامية'' کے محترم نگراں ڈاکٹر حمدان بن محمد الحمدان نے داخلہ کے لیے میری نامزدگی کی تصدیق کرتے ہوئے اگلے سال کے لیے میرا تعلیمی وظیفہ جاری کرنے کی تحریر متعلقہ شعبہ جات کو ارسال کردی، جس کی بنیاد پر سالانہ چھٹیوں کے بعد مجھے نیا تعلیمی ویزا مل جاتا اور دارالعلوم دیوبند میں میرے پتہ پر ارسال کردیا جاتا۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے نام شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ کی ایک تحریر

مذکورہ بالا مراحل کے بعد اگلے سال ۱۴۱۰ھ کے لیے دراساتِ علیا کلیۃ التربیۃ میں میرا داخلہ یقینی ہوگیا تھا جس سے شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کی خدمت میں

مزید کچھ عرصہ تک رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا، البتہ ایک اہم مرحلہ ابھی باقی تھا اور وہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مزید چھٹی ملنے کا مرحلہ تھا! کیونکہ میں دارالعلوم کا مدرس تھا اور دارالعلوم نے میری صرف دو سال کی چھٹی کی منظوری دی تھی جس کی مدّت پوری ہو چکی تھی، لہٰذا میں نے شیخ عبد الفتاح ابو غدّہ سے درخواست کی کہ آپ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام ایک تحریر عنایت فرمادیں جس میں ان سے میری مزید چھٹی منظور کرنے کی سفارش کی گئی ہو! شیخ نے خوشی کے ساتھ میری گزارش منظور فرماتے ہوئے حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے نام مندرجہ ذیل سفارشی تحریر لکھ کر میرے حوالہ کردی۔ تحریر کے ایک ایک لفظ سے شیخ کی بے انتہا تواضع و بلند اخلاق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور انہوں نے اس ناکارہ شاگرد سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ میں اپنے لیے فالِ نیک اور باعثِ سعادت تو ضرور سمجھتا ہوں، تاہم اپنے آپ کو ان اوصاف کا حامل ہرگز تصور نہیں کرتا جو شیخ نے ذرّہ نوازی فرماتے ہوئے میرے متعلق ذکر کر دیئے ہیں، بلکہ میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے حسنِ ظن (جو ایک کامل و متقی مؤمن کا شیوہ ہوا کرتا ہے) اور خورد نوازی و شفقت کے تحت اپنے اس ادنیٰ شاگرد کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، تحریر کا عکس اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے:

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کا عکس

بسم الله الرحمن الرحيم

إلى سماحة الشيخ الجليل والعلامة النبيل مولانا مرغوب الرحمن
مدير الجامعة الإسلامية دار العلوم ديوبند حفظه الله تعالى وأمتع به

من محبه وراجي دعواته عبد الفتاح أبو غدة

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته،
وبعد فأحمد الله تعالى إليكم، وأرجو أن تكونوا أنتم ومن في حضرتكم الشريفة
بكل خير وحبور وعافية ونعمة.
لقد أكرمنا الله تعالى بلسان صدق منكم، ووافد خير منكم، هو الأخ
الفاضل الشيخ عبد الرؤوف خان عبد الودود، فقد كان ترجمان خير
لجامعتكم ونبراس صدق للتلمذة عليكم، فقد حظي بحب كل عارفيه،
من طيب سيرته وأخلاقه الرضية، ومن جده العلمي وذكائه
الفطري وصفائه الروحي والنفسي، فقد أحسنتم الغرس وأطبتم
الوفادة، وهو قد تشرف بالعبد الضعيف حبًا (ورأسمن زادهم)،
فطلب من جامعتنا هنا تمديد دراسته، وحبًا منهم له وتقديرًا لمواهبه
وأخلاقه الزكية أجابوا طلبه بانشراح وفرح.
فإذا تكرمتم بالموافقة على استمرار بقائه يكون في ذلك خير كثير
إن شاء الله تعالى، له ولجامعتكم ولجامعتنا، فإن المثال الصحيح
قليل، والمثال المعلول كثير وكثير جدًا، فأكرموا ببقائه عندنا ولو سنة
واحدة، والله يجزي المتصدقين، وتقبلوا أطيب تحياتي واحترامي
لسماحتكم، مع رجاء دعواتكم، ودفع تحياتي لسادتنا المشايخ الكرام
في ساحتكم، وأستودعكم الله إلى لقاء قريب حبيب بإذن الله، والسلام عليكم
ورحمة الله.   ٢٨/١١/١٤٠٩   محبكم عبد الفتاح أبو غدة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت شیخ معظم ومکرم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند حفظه الله وأ متّع بہ ان کے مخلص دوست اور ان کی دعاؤں کے طلبگار عبدالفتاح أبوغدہ کی طرف سے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بعد از سلام الحمد للہ! میں ٹھیک ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کے متعلقین خیر وخوشی اور عافیت ونعمت سے سرشار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے ایک سچے ترجمان اور بہترین نمایندہ برادرِ باکمال شیخ عبد الرؤف خان عبدالودود کے ذریعہ ہمیں اعزاز بخشا، موصوف آپ کے جامعہ کے ایک بہترین نمایندے اور آپ کے ایک سچے شاگرد ثابت ہوئے، وہ اپنے صاف ستھرے طرزِ عمل و بلند اخلاق، علمی جدوجہد وفطری ذہانت اور روحانی ونفسیاتی پاکیزگی کی بدولت اپنے تمام جاننے والوں کی محبت سے بہرہ ور ہوگئے، جس سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ نے اچھا پودا لگایا ہے اور عمدہ نمایندہ کا انتخاب فرمایا ہے۔ موصوف نے اس کمزور بندہ سے عقیدت ومحبت کا تعلق قائم رکھا (جو درحقیقت ورم والے کو موٹا سمجھنے کے مترادف ہے) اور جامعہ میں مزید پڑھنے کی درخواست پیش کی اور جامعہ کے ذمہ داروں نے ان سے محبت کی خاطر اور ان کی صلاحیتوں اور پاکیزہ اخلاق کے احترام میں شرح صدر وخوشی کے ساتھ ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔

لہٰذا اگر آپ بھی ان کو یہاں پر مزید رہنے کی اجازت عنایت فرمائیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ! یہ موصوف کے حق میں اور آپ کے جامعہ اور ہمارے جامعہ کے حق میں

زیادہ بہتر ہوگا، اس لیے کہ بہترین نمونہ کا وجود شاذونادر بنتا جارہا ہے اور ناقص نمونوں کے وجود میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، پس کم از کم ایک سال کے لیے آپ ان کو ہمارے پاس رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرماتے ہیں، اور ایک مرتبہ پھر آپ کے حضور میں خراجِ عقیدت و احترام پیش کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ ہمیں دعا میں یاد فرمائیں گے اور آپ کے یہاں جو دیگر ہمارے قابلِ احترام مشائخ ہیں ان کی خدمت میں بھی سلام پیش فرمائیں گے، اور آپ کو اس امید کے ساتھ اللہ کے سپرد کرتا ہوں کہ اللہ عن قریب ایک خوشگوار ملاقات کا موقع عطا فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا مخلص

عبدالفتاح أبوغدّہ

۲۸/۱۱/۱۴۰۹ھ

”جامعة الملك سعود“ سے احقر کی دار العلوم دیوبند واپسی

”جامعة الملك سعود“ میں اپنا دو سالہ کورس ۱۴۰۸ھ-۱۴۰۹ھ کو مکمل کرنے کے بعد حضرت شیخ ابوغدّہ کی مذکورہ بالا تحریر کے ساتھ احقر کی دار العلوم دیوبند واپسی ہوئی، ارادہ یہ تھا کہ اگر دار العلوم نے اجازت دی تو مزید کچھ عرصہ تک ”جامعة الملك سعود“ جا کر حضرت شیخ ابوغدّہ سے استفادہ کروں گا، لیکن جب میں نے شیخ کی تحریر حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں پیش کر دی اور ان سے اور اپنے اساتذۂ کرام سے مشورہ طلب کیا تو سب نے یہ مشورہ دیا کہ تمہیں دار العلوم دیوبند میں تدریس کا جو موقع نصیب ہوا ہے یہ بہت بڑی سعادت اور علمی ترقی کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے، اور سلسلۂ تدریس میں طویل انقطاع مناسب نہیں معلوم ہوتا ، لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ تم نے جو دو سال ”جامعة الملك سعود“ میں گزارے ہیں اور اس دوران شیخ ابوغدّہ سے استفادہ کا موقع بھی ایک حد تک حاصل کر لیا ہے' اسی پر اکتفا کریں اور دار العلوم کی ضرورت اور تدریس کی اہمیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سعودی عرب جانے کا ارادہ ترک کریں۔ حضرت مہتمم صاحب اور اساتذہ کرام کے اس مشورہ کے بعد سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا، اس لیے ان کا حکم اپنے

لیے سعادت سمجھتے ہوئے سعودیہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور فوری طور پر سال ۱۴۱۰ھ کو دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز کر دیا اور حضرت شیخ ابوغدّہ سے مزید استفادہ کرنے کی تمنا پوری نہ ہو سکی، جس کا احساس آج تک باقی ہے۔

"جامعة الملك سعود" کے ماحول میں اپنے مسلک پر احقر کا ثابت قدم رہنا اور اس کے اسباب

سعودی عرب کی درسگاہوں میں پڑھنے والے اپنے ہی مسلک کے بعض طلبہ کو دیکھا گیا ہے کہ وہ وہاں کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنے مسلک میں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احقر پر یہ خصوصی کرم رہا کہ تقریباً دو سال تک وہاں پر رہنے کے باوجود مسلک میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی، بلکہ غیر مقلدین کی بے ضابطگیوں کو قریب سے دیکھ کر اپنے مسلک میں مزید پختگی پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق و فضل و کرم کے بعد اس ثابت قدمی کے ظاہری اسباب چار تھے:

۱:...... میرے استاذ و مرشد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرّہٗ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کی دعاؤں اور ان سے رابطہ میں رہنے کا اثر اور ان کی نسبت و تربیت کی برکات۔

۲:...... حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم العالی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند سے بذریعہ تحریر مسلسل رابطہ اور ان کی نصیحتیں۔

۳:...... حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق اور ان کی شفقتیں۔

۴:...... حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی قدس سرہٗ فاضل دارالعلوم

دیوبند و استاذِ حدیث و تفسیر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کی ایک پر اثر اور جامع و مختصر نصیحت ''جاؤ! لیکن خیال رکھنا کہیں وہاں پر اغواء نہ ہو جاؤ'' جس کا تذکرہ اس سے پہلے کر چکا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مذکورہ بالا چار اسباب کی برکت سے یہ بھی ہوا کہ جب میرا اپنا دو سالہ کورس مکمل ہو گیا اور طالبِ مثالی کی خصوصی سند اور سونے کے چار تمغوں اور دیگر انعامات سے مجھے نوازا گیا تو ''معهد اللغة العربية '' کے مدیر جناب ڈاکٹر محمد یاسین اُلفی کے توسط سے سعودی عرب کی وزارۃ الاعلام نے پر کشش رعایتوں کے ساتھ مجھے ملازمت دینے اور سعودی عرب میں بچوں سمیت مقیم ہونے کی تحریری پیشکش کر دی! اللہ تعالیٰ نے اسی وقت حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی قدس سرہٗ کی مندرجہ بالا نصیحت یاد دلا دی، اور بغیر کسی تأمل کے میں نے شکریہ کے ساتھ اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کر لی، اور شاید اسی نصیحت پر عمل کرنے کا ثمرہ ہے کہ چند سال بعد اللہ تعالیٰ نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں حدیث کی خدمت کا موقع نصیب فرمایا، وللہ الحمد و المنة۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ سے احقر کی آخری ملاقات اور ان کی طرف سے اجازتِ حدیث

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ماہِ رجب ۱۴۱۵ھ کو احقر زیارتی ویزا پر سعودی عرب گیا اور ارادہ یہ تھا کہ حرمین شریفین کی حاضری کے ساتھ ساتھ ''جامعة الملك سعود ریاض'' جا کر وہاں کے اساتذۂ کرام اور بالخصوص حضرت شیخ عبدالفتاح

ابو غدّہ کی خدمت میں بھی حاضری دوں گا، چنانچہ ۱۸ / رجب 1415ھ کو ریاض میں شیخ کی قیام گاہ پر حاضری نصیب ہوئی، شیخ نے اپنی عادتِ جمیلہ کے مطابق مہمان خانہ میں بٹھایا اور میری حیثیت سے کافی بڑھ کر اکرام فرمایا اور اپنی تصنیفی و تحقیقی مصروفیات میں سے ایک اچھا خاصا وقت نکال کر مجھے اپنے علمی ملفوظات اور پند و نصائح سے نوازا اور ساتھ ساتھ انہوں نے افغانستان کے اپنے تازہ سفر کا تذکرہ بھی فرمایا جو مجاہدین کے درمیان مصالحت کے لیے کیا گیا تھا اور افغانستان کے چند شہروں جیسے ہرات، کابل اور بلخ اور وہاں کے علماء کے علمی کارناموں اور تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا، جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ اس سلسلہ میں کوئی مضمون یا رسالہ لکھنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے اپنے تحقیقی ذوق کے مطابق افغانستان کے ایک شہر ''شین ڈنڈ'' کا تذکرہ بھی کیا جس کی زیارت انہوں نے اس تازہ سفر میں کی تھی، اور چونکہ اس شہر کا نام پشتو زباں کا لفظ ہے، اس لیے مجھے حکم دیا کہ زبانی طور پر اس کا صحیح تلفُّظ اور تحریری طور پر اس کی صحیح کتابت دونوں بتادو، تعمیل حکم پر مجھے دعاؤں سے نوازتے ہوئے فرمایا کہ: میں اس میں ایک الف کا اضافہ کرتے ہوئے ''شین دَانڈ'' بولتا اور لکھتا تھا۔

اس نشست میں میں نے ادب کے ساتھ شیخ سے اجازتِ حدیث کی درخواست کی، اس لیے کہ جس وقت ''جامعة الملک سعود''میں سامع کی حیثیت سے میں ان کے درسِ اصول الحدیث میں حاضر ہوا کرتا تھا اس وقت میں ان کے حلقۂ درس کا باضابطہ طالبِ علم نہیں بلکہ صرف سامع تھا، اور سامع بھی

روایتِ حدیث کا نہیں بلکہ درسِ اصول الحدیث کا، اور چونکہ اس وقت ارادہ یہ تھا کہ اگلے سال ان شاء اللہ! ان کے باقاعدہ شاگرد کی حیثیت سے حاضری ہوگی اور پھر اجازتِ حدیث کی صورت بھی پیدا ہوجائے گی، لہٰذا اُس سے پہلے ان سے اجازتِ حدیث کی درخواست نہ کرسکا، لیکن جیسا کہ اس سے پہلے لکھ چکا ہوں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مجھے مزید چھٹی نہ مل سکی اور شیخ کی خدمت میں باضابطہ طالبِ علم کی حیثیت سے حاضری کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی۔

بہرصورت! اِس ملاقات میں ہمّت کرکے میں نے ان سے اجازتِ حدیث کی درخواست کی! انہوں نے صرف زبانی ہی نہیں بلکہ تحریری طور پر ایک خصوصی اجازت نامہ سے سرفراز فرمایا، اور وہ اس طرح کہ ان کے سب سے محبوب استاذ حضرت علّامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۳۷۱ھ) کی اسانید کا مجموعہ جو ''التحرير الوجيز فيما يبتغيه المستجيز'' کے نام سے ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ کی شکل میں چھپ چکا تھا دکھایا اور فرمایا کہ اس مجموعہ کے محدود نسخے میں نے اس مقصد کے لیے چھپوائے ہیں کہ اپنے بعض مخصوص ساتھیوں (شاگردوں) کو اجازتِ حدیث دیتے ہوئے اپنے شیخ حضرت علّامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ''ثَبَت'' (اسانید کا مجموعہ) بھی پیش کیا کروں گا، تاکہ ان کو شیخ کی اسانید کا پتہ بھی چلے اور میرے ساتھ ساتھ میرے شیخ اور ان کے مشائخ سب کو دعاؤں میں یاد رکھا کریں، پھر انہوں نے اُس رسالہ کے سرورق پر اپنے ہاتھ سے تحریری اجازت نامہ لکھ کر مجھے عنایت فرمایا، قارئین کی دلچسپی کے لیے اجازت نامہ کا عکس درج کیا جارہا ہے:

شیخ عبدالفتاح ابو غدہّ کی طرف سے اجازت نامۂ حدیث کا عکس

بسم الله الرحمن الرحيم الحمد لله والصلاة والسلام على سيدنا محمد رسول الله،

وبعد فقد أجزت الأخ الكريم المحب في الله الشيخ عبد الرؤوف خان

ابن عبد الودود الأفغاني - كان الله له، وبلّغه من الخير أمله - بما

أجازني به شيوخي رحمهم الله تعالى ورجاء دعواته لهم، وفي طليعتهم شيخنا

الإمام الكوثري صاحب هذا الثبت، وبما صح لي وعني، آملاً منه أن

يذكرني بصالح دعواته، وأوصيه ونفسي بتقوى الله في السر والعلن،

والله ولي المتقين. قاله وكتبه عبد الفتاح أبو غدة في الرياض ١٤٠٥/٦/١٨

التحرير الوجيز فيما يبتغيه المستجيز

شیخ ابو غدہؒ کی ایک اہم نصیحت

حضرت شیخ ابو غدّہ نے اس نشست میں اجازتِ حدیث کی مناسبت سے برّصغیر کے دینی مدارس کا ذکر کرتے ہوئے ان کی دینی اور اصلاحی خدمات کو سراہا اور ساتھ ساتھ حدیث پڑھانے والے بعض حضرات کے طرزِ تدریس کے ایک قابلِ اصلاح پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''برصغیر کے مدارس میں حدیث پڑھانے والے بعض حضرات سال کے شروع میں اتنی لمبی تقریریں کرتے ہیں کہ زیادہ تطویل کی وجہ سے طلبہ کے لیے نا قابلِ فہم اور غیر مفید ہوا کرتی ہیں اور سال

کے آخر میں چونکہ کتاب کا اکثر حصہ باقی رہ جاتا ہے اور ختم کرانا ضروری ہوتا ہے تو نہایت مختصر بات کرتے ہیں یا صرف عبارت پر اکتفا کرتے ہوئے ایک ہی گھنٹہ میں تقریباً ایک سو حدیثیں پڑھاتے ہیں، جس سے طلبہ کو بڑا نقصان ہوتا ہے، شیخ نے اس طرزِ تدریس پر تنقید فرماتے ہوئے مجھے نصیحت کی کہ تم شروع سے آخر تک اعتدال و پابندی کے ساتھ پڑھانے کی کوشش کرو اور میری یہ گزارش حدیث پڑھانے والے دوسرے حضرات تک بھی پہنچادو۔''

حضرت علّامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ قدّس سرّہٗ العزیز کی مذکورہ بالا نصیحت سے مجھے بڑا فائدہ محسوس ہوا، اور میں اس مضمون کے ذریعہ شیخ کے حکم کے مطابق ان کی مذکورہ نصیحت کو حدیث پڑھانے والے دوسرے اہلِ علم حضرات تک بھی پہنچانا چاہتا ہوں، جیسا کہ اس سے قبل عربی مجلّہ ''البیّنات'' شمارہ نمبر: ۴، ۱۴۲۵ھ اور دارالعلوم دیوبند کے عربی مجلّہ ''الدّاعی'' شمارہ نمبر ۳، ۴ ماہِ ربیع الاوّل-ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ میں میرے عربی مضمون کے اندر شیخ کی یہ نصیحت شائع ہوچکی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ ابوغدّہ کی وفات اور مسجدِ نبوی میں نمازِ جنازہ اور جنت البقیع میں تدفین

حضرت علّامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ہجری قمری کے حساب سے اپنی مستعار زندگی کے اکیاسی سال اور چند مہینے، اور سنہ میلادی شمسی کے حساب سے تقریباً اُناسی سال اس دارِ فانی میں گزار کر بروزِ یکشنبہ ۹/ ۱۰/ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۶/ ۲/ ۱۹۹۷ء فجر کے وقت ریاض کے ایک ہسپتال ''مستشفی الملک فیصل التخصصی'' میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور بروز دوشنبہ ۱۰/ ۱۰/ ۱۴۱۷ھ شاہی

فرمان کے مطابق ان کی نعش کو خصوصی طیارہ کے ذریعہ مدینہ منورہ منتقل کیا گیا، جہاں مسجدِ نبوی میں بعد نمازِ عشاء ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی جس میں ایک جمِ غفیر نے شرکت کی، نماز جنازہ کے بعد ان کے جسدِ خاکی کو جنّت البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔

اللہ اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

شیخ نے اپنے پیچھے ہزاروں شاگرد اور تالیفات وتحقیقات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا، جن میں سے باسٹھ کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوکر مقبولِ خاص وعام بن گئی تھیں، اور بعض زیرِ طباعت اور بعض پر کام جاری تھا کہ ان کا وصال ہوگیا، اب ان کے علمی وتحقیقی کاموں کی تکمیل میں ان کے باکمال و باصلاحیت صاحبزادے شیخ سلمان اُبوغدّہ حفظہ اللہ لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شیخ ابوغدہ کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے اور ان کی تالیفات اور علمی واصلاحی کارناموں سے لوگوں کو تا روزِ قیامت مستفید ومستفیض ہونے کا موقع عنایت فرمائے۔

دارالعلوم دیوبند
کا
نیاز مندانہ سفر

خود ساقیٔ کوثر نے رکھی مے خانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے دیوانوں کی روداد یہاں

(مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ)

دارالعلوم دیوبند
کا
نیازمندانہ سفر

دارالعلوم دیوبند کا افتتاح بروز پنجشنبہ ۱۵ رمحرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء مسجد چھتہ دیوبند کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے درخت کے نیچے نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب ونمائش کے بغیر اہل اللہ کی ایک جماعت کے ذریعے-جس کے سرخیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۲۹۷ھ) تھے-عمل میں آیا۔ صلحاء واہل اللہ کی اس جماعت کے پاس اس مدرسہ کے لیے نہ کوئی عمارت تھی، نہ عمارت بنانے کا سرمایہ، نہ پروپیگنڈہ تھا، نہ اعلان واشتہار کا تخیل، اخلاص وخدمتِ دین اور توکل علی اللہ ان کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔

اس ادارہ کے قیام کا بنیادی مقصد اسلامی عقیدہ کا تحفظ، کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم وترویج، بدعات وغیر اسلامی رسومات کا خاتمہ، مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی اور ان میں دینی حمیّت واسلامی غیرت کا جذبہ بیدار کرنا تھا۔ بانیان کے اخلاص وتوکل علی اللہ کی برکت سے یہ چھوٹا سا گمنام مدرسہ ترقی کی طرف گامزن ہوا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد برصغیر کا سب سے بڑا دینی ادارہ بن کر ''ازہرالہند'' کے لقب سے موسوم ہوا، اور کرۂ ارض کے ہر حصہ سے آنے والے تشنگانِ علومِ نبوت کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی شہرت ومقبولیت کی آواز مشترکہ ہندوستان سے نکل کر جہاں افغانستان، بخارا وسمرقند کے پہاڑوں میں گونجنے لگی، وہاں عالمِ عرب کے

ریگستانوں اور افریقہ کے جنگلات تک بھی جا پہنچی۔ حسنِ نیت، اخلاص وللّٰہیت اور توکل علیٰ اللہ کے کرشمے اسی طرح ہوا کرتے ہیں۔

دار العلوم دیوبند کا پہلا سفر

رواں پندرھویں صدی ہجری کے شروع میں جب راقم الحروف افغانستان و پاکستان کے سرحدی علاقوں کے دینی مراکز میں فنون کی کتابوں میں منہمک اور زیرِ تعلیم تھا، اس نے بعض مشفق اساتذۂ کرام کی ترغیب اور والدین محترمین کی اجازت سے دار العلوم دیوبند جانے کا ارادہ کیا، تاکہ ایک ایسے سرچشمۂ فیض وبرکت سے علمی پیاس بجھانے کا موقع ملے جس کے بعد کسی اور سرچشمہ کو تلاش کرنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہ رہے۔

احقر کے پاس اس سفر کے لیے درکار وسائل اگرچہ نہ ہونے کے برابر تھے، تاہم اس اعتماد کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ طالب علم کے لیے آسانیاں پیدا فرماتا ہے' اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ سفر کے دوران مختلف دشواریوں کا سامنا ہوتا رہا، لیکن امدادِ خداوندی سے ان دشواریوں سے نکلنے کے راستے بھی بنتے رہے، یہاں تک کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا موقع نصیب ہوا، اور امتحانِ داخلہ میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی کے ساتھ دورۂ حدیث کے اندر دار العلوم دیوبند میں داخلہ ہوگیا، اس داخلہ کی وجہ سے جو خوشی احقر کو حاصل ہوئی تھی وہ پوری زندگی کی ایک یادگار خوشی تھی اور میری کیفیت اس شعر کے مطابق تھی:

شکرِ خدا کہ ہرچہ طلب کردم از خدا
بر منتہائے مقصد خود کامران شدم

بہر صورت! دورۂ حدیث میں اپنے عظیم المرتبت اساتذہ کے پاس پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک سال کے بعد فراغت ہوئی۔ امتحانِ سالانہ میں اللہ کی توفیق اور اساتذۂ کرام کی دعاؤں کی برکت سے اپنی جماعتِ دورۂ حدیث میں بھی اور پورے دارالعلوم کی سطح پر بھی پہلی پوزیشن حاصل کی، اور اگلے سال کے لیے آسانی کے ساتھ شعبۂ افتاء (تخصص فی الفقہ) میں داخلہ ہوا جس کی مدتِ تعلیم ایک سال ہوا کرتی تھی، اس شعبہ کے سالانہ امتحان میں بھی بحمد اللہ وتوفیقہٖ پہلی پوزیشن حاصل کرلی۔ اس کامیابی کی بنیادی وجہ اللہ کی توفیق کے بعد دارالعلوم دیوبند کا بامقصد ومنظم تعلیمی نظام، اساتذۂ کرام کا تمام طلبہ اور بالخصوص غیر ملکی طلبہ کے ساتھ نہایت شفقت والفت کا معاملہ اور ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دینا تھی۔

امامت وخطابت اور تدریس کی ذمہ داری

دورۂ حدیث کے سال ہی احقر کو دارالعلوم دیوبند کی مسجد (مسجد قدیم) کا امام وخطیب مقرر کیا گیا اور فراغت کے بعد اپنے اساتذۂ کرام وبزرگوں کے حکم ومشورہ سے تدریس کے لیے درخواست دی۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی، کم عمری، عملی کمزوری اور ناتجربہ کاری کا پورا احساس تھا اور اپنے آپ کو ہرگز دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا اہل نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی درخواست دینے کی جرأت کرتا، لیکن اپنے اساتذۂ کرام کے حکم ومشورہ کو ہمیشہ اپنے لیے باعثِ خیر وبرکت سمجھنا اور اپنے احساسات پر اس کو ترجیح دینا اپنا معمول بن چکا تھا، لہٰذا اس معاملہ میں بھی اپنے احساس کو دباتا ہوا اساتذۂ کرام کے مشورہ پر عمل کیا، چنانچہ دارالعلوم کے نظام کے

مطابق اکابرین کی ایک کمیٹی نے انٹرویو لیا، جس کے نتیجے میں احقر کا تقرر بحیثیت مدرس عمل میں آیا اور ماہ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو باقاعدہ تدریس کا آغاز بھی کر دیا۔

دارالعلوم دیوبند میں تقرری کے بعد احقر کو اپنے اساتذۂ کرام سے استفادہ کرنے کا بہترین موقع میسر آیا، اس لیے کہ عملی تجربہ شروع کرنے کے دوران چھوٹوں کو بڑوں کی رہنمائی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اور چونکہ ان کو ذمہ داری کا احساس شروع ہونے لگتا ہے تو استفادہ کی طرف توجہ بھی زیادہ دیتے ہیں۔ چنانچہ احقر نے یہ ہرگز خیال نہیں کیا کہ میں مدرس بن چکا ہوں، بلکہ یہ تصور قائم کیا کہ طالب علمی کا حقیقی دور تو اَب شروع ہوا ہے، اساتذۂ کرام کا سایۂ عطوفت موجود ہے، عملی میدان میں قدم رکھ رہا ہوں، لہٰذا مجھے پوری توجہ اپنے مشفق اساتذہ کے تجربات سے استفادہ کرنے پر مرکوز کرنی چاہیے۔

لہٰذا! اساتذۂ کرام کے نظام الاوقات اور ان کے مراتب کی رعایت کرتا ہوا ان سے ملاقات کرنے اور ان سے تدریسی، تربیتی اور عملی میدان میں استفادہ کرنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت الاستاذ، فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہٗ سے اصلاحی تعلق کا سلسلہ بھی قائم ہوا اور ان کی اصلاحی و علمی مجلسوں میں حتیٰ الامکان شریک ہونے کا بھی اہتمام کیا۔ میرے تمام اساتذۂ کرام کو اللہ تعالیٰ بہترین صلہ عطا فرمائے جنہوں نے ہر ہر قدم پر رہنمائی فرمائی اور کبھی بھی مجھے مایوس یا محروم نہیں ہونے دیا۔

امامت وخطابت، تعلیم وتدریس اور اساتذۂ کرام کے زیرِ سایہ رہ کر ان سے استفادہ کرنے کا یہ سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، ان دس سالوں میں

دارالعلوم دیوبند اور اس کی پُر کیف علمی و عملی فضاء سے محبت و تعلق اتنا مضبوط ہو گیا کہ میرے تصور و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں کبھی اس بابرکت ماحول سے جدا ہوں گا، بلکہ یہی تمنا تھی کہ اپنی زندگی کی آخری رمق تک یہیں رہوں اور یہیں سے میرا جنازہ اٹھے اور اپنے بزرگوں کے اقدامِ عالیہ میں مزارِ قاسمی کے اندر مدفون ہونے کی سعادت نصیب ہو۔ لیکن تقدیرِ خداوندی کچھ اور تھی۔ ۱۲/ شعبان ۱۴۱۲ھ کو حضرت والد ماجد کا **مضافاتِ** کوئٹہ بلوچستان میں انتقال ہوا (رحمہ اللہ تعالیٰ) اور والدہ محترمہ (بارك الله في صحتها وعافيتها وحياتها) نے مجھے حکم دیا کہ اپنی والدہ، بھائیوں اور بہنوں کو سنبھالنے کے لیے اب تمہارا پاکستان آنا ناگزیر ہو گیا ہے، لہٰذا اللہ پر توکل کر کے مستقل طور پر واپس پاکستان آجاؤ۔

دارالعلوم دیوبند سے فراق کا غم

دارالعلوم دیوبند کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اگر کوئی طالب علم صرف ایک ہی سال وہاں پڑھ کر فارغ التحصیل ہو جاتا ہے اور اگلے سال اس کو جانا ہوتا ہے تو وہ غمِ فراق میں تڑپتا رہتا ہے، اور اگر کسی کو کچھ زیادہ عرصہ دارالعلوم میں پڑھنے کا موقع مل جاتا ہے اور دارالعلوم کی محبت اس کی رگ و پے میں پیوست ہو جاتی ہے اور پھر اس سے جدائی کا وقت آجاتا ہے تو اس کی بے تابی و پریشانی ایسی ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کو بھی غم میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اب غور فرمائیے! ایک طالب علم جو بڑی دشواریوں کے بعد اس بابرکت ادارہ میں پہنچا ہو، اور پھر فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید دس سال تک وہاں پر تدریس کا موقع اور ساتھ ساتھ امامت و خطابت کا موقع عنایت فرمایا ہو، اور جب

بھی کوئی علمی دشواری پیش آئی ہو تو حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم العالی اور دیگر مشفق اساتذۂ کرام سے استفادہ کی صورت میسر رہی ہو اور اپنے استاذ ومرشد مفتیِ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند قدس سرہٗ سے اصلاحی تعلق کا سلسلہ قائم ہوگیا ہو اور ان کی صحبت میں رہنے کی سعادت کا موقع مل رہا ہو، تو ایسے عاجز بندے کو اس ادارہ کے در و دیوار اور پُرکیف فضاء سے کتنی پختہ محبت قائم ہوگئی ہوگی؟! اور اس ادارہ اور اپنے اکابرین کی صحبت سے جدائی برداشت کرنے میں اس کے لیے کتنی بڑی آزمائش چُھپی ہوئی ہوگی؟!

اس پوری کیفیت کو بیان کرنا مشکل بھی ہے اور طویل بھی، صرف ایک ہی واقعہ نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

''جب یہ بات طے ہوگئی کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو الوداع کہنا ہے تو جمعہ کی نماز حسبِ معمول مسجد دارالعلوم (مسجد قدیم) میں پڑھا رہا تھا اور یہ تصور دل میں قائم تھا کہ شاید دارالعلوم دیوبند میں امام وخطیب کی حیثیت سے یہ آخری نماز جمعہ ہو تو شدتِ احساسِ فراق کی وجہ سے میرے جسم پر ایک لرزہ طاری تھا اور قریب تھا کہ خطبہ کے دوران اپنے آپ کو کنٹرول نہ کرسکنے کی وجہ سے منبر سے نیچے گر جاؤں، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس مبارک منبر ومحراب کی برکت سے ایک حد تک اپنے آپ کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوگیا، گرنے سے تو بچ گیا، البتہ آنکھوں سے اشکِ غم کی روانی کو روکنا میرے بس میں نہ تھا۔'' حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا مندرجہ ذیل شعر میری اُس کیفیت پر صادق آرہا ہے:

زبانِ خامہ ندارد سرِّ بیانِ فراق
وگرنہ شرح دہم با تو داستانِ فراق

کراچی میں قیام اور دارالعلوم دیوبند سے مستقل رابطہ

بہر کیف! میں رمضان المبارک کے آخری دن ۱۴۱۲ھ کو دارالعلوم دیوبند سے قلبِ غمگین کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہوا، اور دل میں ایک بے چینی کی کیفیت تھی، کبھی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا کہ تم نے یہ صحیح فیصلہ نہیں کیا کہ اپنی مادرِ علمی سے جدائی اختیار کر رہے ہو! اُدھر سے جواب ملتا کہ جب حالات ایسے بنے اور تقدیرِ خداوندی نے یہی چاہا تو اب کیا کیا جاسکتا ہے؟ حاصل یہ ہے کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دوسرا شعر میرے اُس ''مکالمۂ نفسی'' پر صادق آرہا تھا:

گفتم کہ خطا کردی و تدبیر نہ ایں بود
گفتا چہ تواں کرد کہ تقدیر چنیں بود

پھر یکا یک ایک ایسا تصور قائم ہوگیا جس سے دل کو اطمینان و تقویت حاصل ہوئی، وہ اس طرح کہ یہ فراق تو جسمانی فراق ہے جس سے روحانی تعلق میں اضافہ تو ہوسکتا ہے کمی نہیں ہوسکتی، ورنہ مدینہ منورہ کے باشندے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ اور اپنے اُس مکان سے - جس میں انہوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ٹھہرایا تھا- ہرگز جدائی کا تصور نہ کرتے، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مدینہ منورہ سے جسمانی فراق کو برداشت کرتے ہوئے اس کے پیغام کو لے کر ہزاروں میل دور ''قسطنطینیہ'' تک پہنچادینے کی سعی فرمائی، یہاں تک کہ وہیں پر وفات پا کر اس کی دیوار کے ساتھ دفن بھی ہوئے، رضي الله عنه وأرضاه-

مذکورہ بالا اور اس سے ملتے جلتے صحابۂ کرامؓ واسلاف عظامؒ کے واقعات پر غور کرتا ہوا یہ تصور قائم ہوگیا کہ دارالعلوم دیوبند صرف در و دیوار کا نام تو نہیں، یہ تو

ایک مشن اور مسلکِ حق کا نام ہے جس کی شاخیں زمین کے ہر ہر حصہ میں موجود ہیں، لہٰذا در و دیوار سے جدائی دار العلوم کے مِشن سے جدائی شمار نہیں ہوگی، بلکہ اللہ سے امید ہے کہ اس ظاہری جدائی کے باوجود اپنی زندگی کی آخری رمق تک اپنی مادرِ علمی کے ساتھ روحانی رشتہ قائم رہے گا، بلکہ اس میں مزید پختگی پیدا ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کے مشن کو پھیلانے کی کوشش کروں گا۔

اسی عزم وارادہ کے ساتھ پاکستان پہنچ کر والدہ محترمہ اور بھائیوں کے مشورہ سے کراچی میں قیام کا فیصلہ کیا جو تادمِ تحریر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کراچی میں میری استعداد وصلاحیت سے بڑھ کر عزت وکامیابی بخشی۔ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ سید محمد یوسف بنوری ٹاؤن- جو پاکستان کا ایک مشہور ومعروف دینی ادارہ ہے- میں تدریسِ حدیث اور مجلہ ''البیّنات'' عربی کی ادارت کا موقع ملا، نیز جامع مسجد طوبیٰ ڈیفنس- جوکہ پورے پاکستان کی سطح پر ایک مشہور ومعروف مسجد ہے- میں امامت وخطابت کے ذریعہ عام مسلمانوں کی دینی خدمت کا موقع میسر ہوا۔ اس کے علاوہ اہلِ علم حضرات نے بے حد شفقت وہمت افزائی کا معاملہ فرمایا اور طلبۂ عزیز کے درمیان بھی اللہ تعالیٰ نے میری تمام نااہلی کے باوجود مقبولیت کی دولت سے نوازا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان تمام نعمتوں کے حصول میں بنیادی کردار دار العلوم دیوبند کی نسبت اور اساتذۂ کرام ووالدہ محترمہ کی دعاؤں نے ادا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کراچی میں رہ کر اپنی مادرِ علمی دار العلوم دیوبند اور وہاں کے مشایخ واساتذۂ کرام سے ظاہری جدائی کے باوجود رابطہ منقطع نہیں ہوا۔ ان کے ذکرِ خیر اور ایمان افروز واقعات کا تذکرہ اپنے درس وتدریس اور

بیانات ومجالس کے دوران برابر جاری رہا، اور خط وکتابت وٹیلی فون کے ذریعہ بھی وقتاً فوقتاً رابطہ قائم رہا اور مشورہ طلب امور میں ہمیشہ مشورہ کرتا رہا۔ ان تمام رابطوں کے باوجود ظاہری جدائی سے پریشان اور دارالعلوم کے درودیوار- جس کی محبت وانسیّت دل میں پیوست ہوچکی تھی- کی زیارت اور مشائخ واساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضری کے لیے دل تڑپتا رہا۔ ویزا حاصل کرنے کی بار بار کوشش کی، لیکن دونوں ملکوں کے تعلقات کے اتار چڑھاؤ اور ویزا قوانین میں سختی کے باعث کامیابی حاصل نہ کرسکا۔

خوابوں میں دارالعلوم دیوبند کی زیارت اور ایک لطیفہ

مجھے عام طور پر خواب کم نظر آتے ہیں، لیکن دارالعلوم دیوبند سے والہانہ تعلق اور باربار اس کے تذکرہ کی بنیاد پر اکثر خواب کے اندر بھی اس کا احاطہ، اس کی پُرکشش وبابرکت درسگاہیں اور اساتذۂ کرام نظر آتے رہتے ہیں، اور خواب ہی کے اندر اس بات پر بے حد خوشی کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے مشائخ کی زیارت سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہوں، اور بعض دفعہ زیادہ خوشی کی وجہ سے رونے کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس سے آنکھ کھل جاتی ہے، تب پتہ چلتا ہے کہ یہ تو محض خواب ہی تھا اور دلی خواہش ہوتی ہے کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر بن جائے۔

ایک دفعہ یہ لطیفہ پیش آیا کہ میں نے خواب دیکھا کہ: ''میں دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا ہوں، اور احاطۂ باغ- جہاں میرا کمرہ ہوا کرتا تھا- میں داخل ہوکر بے انتہا خوش ہو رہا ہوتا ہوں، موسم بھی بہت ہی خوشگوار اور سورج چمک رہا ہوتا ہے۔

میں اس بات پر زیادہ خوش ہوتا ہوں کہ آج اپنی مادرِ علمی کو بیداری کی حالت میں دیکھ رہا ہوں، اور اپنا جائزہ بھی لیتا ہوں کہ آج کی یہ زیارت تو بیداری کی حالت میں ہے، محض ایک خواب نہیں، پھر اپنے پرانے کمرے (احاطۂ باغ کمرہ نمبر:۱۱) کی طرف آگے بڑھتا ہوں تو وہاں پر دارالعلوم کے کوئی نئے استاذ قیام پذیر ہوتے ہیں، ان سے مل کر اس بات کا تذکرہ کرتا ہوں کہ اس کمرے میں پہلے میں رہا کرتا تھا، اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ دارالعلوم سے جدائی کے بعد ہمیشہ اُسے خواب میں دیکھا کرتا تھا، لیکن آج میری خوش قسمتی ہے کہ اُسے بیداری کی حالت میں دیکھ رہا ہوں، اور اس دوران زیادہ خوشی کی وجہ سے مجھ پر رقّت طاری ہوتی ہے۔''

اُس رقت سے آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ رات کی تاریکی میں اپنے بستر پر شہر کراچی کے اندر پڑا ہوا ہوں، رقت تو خواب کے اندر خوشی کی وجہ سے طاری ہو ہی چکی تھی، بیداری کے بعد یادِ دارالعلوم اور غمِ فراق نے اُس رقت میں اور اضافہ کر دیا اور کچھ دیر تک اپنے بستر پر آنسو بہاتا رہا، اور حافظؒ کا مندرجہ ذیل شعر اپنی اس کیفیت پر منطبق پاتا رہا:

ز بہرِ وصل تو در حیرتم چہ چارہ کنم؟
نہ در برابر چشمی نہ غائب از نظری

اپنے مشائخ واساتذۂ کرام کی زیارت کے چند مواقع

دارالعلوم دیوبند سے فراق کے بعد اس کی زیارت کے اسباب تو پیدا نہیں ہو رہے تھے، البتہ دارالعلوم کے مشائخ واساتذۂ کرام سے وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کے

کچھ مواقع دارالعلوم سے باہر ملتے رہے، جن سے دردِ فراق کو وقتی طور پر کچھ ہلکا ہونے کا سہارا ملتا رہا، چنانچہ ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کو اپنے استاذ و مرشد فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند (متوفّٰی ۱۴۱۷ھ) قدس سرہٗ کی خدمت میں ''ڈھاکہ'' بنگلہ دیش حاضری ہوئی جہاں حضرت اپنے متعلقین کے ساتھ اعتکاف فرما رہے تھے۔ احقر کو بھی چند ہی دن اعتکاف اور حضرت فقیہ الامت قدس سرہٗ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا اور مسجد چھتہ دارالعلوم دیوبند کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ حضرت فقیہ الامت کی زندگی کا آخری رمضان ہے۔ لیکن وہی ہوا جو اللہ نے مقدر فرمایا تھا، ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ کو جنوبی افریقا میں سفر کے دوران حضرت کا وصال ہوا، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

اسی طرح ''ڈیڑھ سو سالہ خدماتِ دارالعلوم دیوبند'' کے عنوان سے ایک سہ روزہ کانفرنس بتاریخ ۱۴، ۱۵، ۱۶ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ مطابق ۹، ۱۰، ۱۱ اپریل ۲۰۰۱ء جمعیت علمائے اسلام پاکستان کی طرف سے پشاور میں منعقد کی گئی تھی جس میں حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب صدر جمعیت علمائے ہند و رکنِ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم کے بڑے اساتذۂ کرام کو خصوصی طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس موقع پر حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب برد اللہ مضجعہٗ، حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم اور چند دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب استاذِ حدیث دارالعلوم

دیوبند مدظلہم چند مرتبہ کراچی تشریف لائے اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، بلکہ احقر کی تمنا پر ہر مرتبہ غریب خانہ کو تشریف آوری سے نوازا۔ اور ماہِ شعبان ۱۴۳۳ھ کو ''جامعہ اسلامیہ لوساکا'' - جو افریقی ملک ''زامبیا'' میں واقع ایک دینی ادارہ ہے- کی طرف سے احقر کو اس کے سالانہ اختتامی پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس پروگرام کے مہمان خصوصی استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مدظلہم ہوں گے۔

احقر کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی، اور بخوشی دعوت کو قبول کرکے بتاریخ ۴/۸/۱۴۳۳ھ مطابق ۲۴/۶/۲۰۱۲ء کراچی سے ''زامبیا'' پہنچا، اور بتاریخ ۱۰/۸/۱۴۳۳ھ مطابق ۳۰/۶/۲۰۱۲ء حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہم بھی تشریف لائے اور دس دن تک ان کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ واپسی میں بھی ''دبئی'' ایئرپورٹ تک ایک ہی جہاز میں ان کے ساتھ رہا۔ دبئی ایئرپورٹ سے وہ دہلی اور احقر کراچی روانہ ہوا اور اس سفر کا ایک بنیادی مقصد حاصل ہوگیا۔ اس سفر میں مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے استاذ محترم سے یہ درخواست کی تھی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دارالعلوم دیوبند کی زیارت اور وہاں پر آپ کے درسِ حدیث میں حاضری کا ایک موقع عطا فرمائیں۔

ماہِ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ کو حجازِ مقدس میں حج کے موقع پر بھی حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم، ان کے چھوٹے بھائی جناب مولانا سید اسجد مدنی صاحب زید لطفہم، حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند مدظلہم، حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی صاحب استاذِ حدیث و مدیر ''ماہنامہ

دارالعلوم دیوبند" زیدمجدہم اور محترم دوست جناب مولانا عبدالخالق سنبھلی استاذ حدیث و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند حفظہ اللہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور وہاں دارالعلوم دیوبند کی یادیں خوب تازہ ہوگئیں۔

بہرصورت! دارالعلوم دیوبند کو خیر باد کہنے کے بعد تقریباً ۲۳ ر سال بیت گئے اور وہاں پر جانے کی کوئی صورت کوشش کے باوجود میسر نہ آسکی، البتہ۔جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے۔ رابطہ کا سلسلہ اور دارالعلوم سے دور مختلف مقامات پر دارالعلوم کے مشائخ واساتذہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ بدستور قائم رہا، اور یہ دعا کرتا اور کراتا رہا کہ اللہ تعالیٰ وہاں پر حاضری کی کوئی صورت بھی پیدا فرمادیں۔

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی طرف سے دیوبند حاضری کی دعوت

دارالعلوم دیوبند کی زیارت کے لیے بے تابی میں دن بہ دن اضافہ ہورہا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دل کی آواز سن لی اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم صدر جمعیت علمائے ہند اور استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی طرف سے "عظمت صحابہؓ کانفرنس"۔جو ۹/ ۵/ ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۱/ ۳/ ۲۰۱۴ء کو دارالعلوم دیوبند میں منعقد ہونے والی تھی۔ میں شرکت کا دعوت نامہ میرے مخلص دوست جناب مولانا مفتی مظہر شاہ صاحب بہاولپوری زیدلطفہم کے توسط سے موصول ہوا۔ دعوت نامہ میں پاکستان سے کل تقریباً پچیس حضرات مدعو تھے جن میں احقر کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا مفتی مظہر شاہ صاحب نے فرمایا کہ آپ حضرات کے

پاسپورٹ ہم خود آپ سے لے کر اسلام آباد میں واقع انڈین سفارت خانہ سے ویزا لگوا کر واپس کر دیں گے اور ان شاء اللہ! کانفرنس کی مقررہ تاریخ سے پہلے ہم سب لوگ روانہ ہو کر کانفرنس میں شرکت کریں گے۔ احقر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا! اس لیے کہ ایک طرف سے دار العلوم دیوبند کی زیارت کا موقع ملنے والا تھا اور دوسری طرف مذکورہ تاریخوں میں ششماہی امتحان کی وجہ سے اسباق موقوف ہوتے اور ان کا حرج بھی نہ ہوتا۔

چنانچہ مولانا مفتی مظہر شاہ صاحب کی معرفت سے تمام حضرات کے پاسپورٹ اسلام آباد بھیجے گئے، لیکن انڈین سفارت خانہ نے نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر ویزا دینے میں دیر لگا دی اور کانفرنس کی مقررہ تاریخ گیارہ مارچ سے پہلے کسی کو بھی پاسپورٹ واپس نہ مل سکا، لہٰذا ''عظمت صحابہؓ کانفرنس'' میں شرکت کا موقع ہاتھ سے نکل گیا، البتہ ویزا کچھ تاخیر کے ساتھ سب کو مل گیا، اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم نے پیغام بھیجا کہ چونکہ ویزا تو لگ گیا ہے، لہٰذا آپ حضرات مذکورہ کانفرنس میں نہ سہی، دار العلوم دیوبند کی زیارت کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق تشریف لائیں اور آپ حضرات میرے مہمان ہوں گے۔

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کے اس پیغام کے بعد دیگر مدعو حضرات نے تو ماہِ اپریل کے شروع میں سفر کا ارادہ و انتظام فرمایا، لیکن احقر نے دو وجہ سے اپنا سفر مزید مؤخر کر دیا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ ماہِ اپریل مطابق ماہِ جمادی الثانی میں ششماہی امتحان کے بعد اسباق دوبارہ زور و شور کے ساتھ جاری ہو چکے تھے اور جامعہ کے نظام کے مطابق وسطِ رجب تک سالانہ نصاب مکمل کرانا

ضروری ہوتا ہے، اور سفر کی صورت میں اسباق کا نقصان ہوتا، اور وقت مقررہ تک مناسب انداز کے ساتھ اسباق کا مکمل کرانا مشکل ہوجاتا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے تقریباً ۲۳؍سال بعد اپنی مادرِ علمی اور اپنے مشائخ و بزرگوں کی خدمت میں حاضری کا موقع نصیب ہورہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یکسوئی کے ساتھ اپنے اساتذۂ کرام و مشائخِ دارالعلوم اور دوست واحباب کی زیارت کروں اور حتیٰ الامکان ہر ایک سے انفرادی طور پر ملنے کی سعادت حاصل کروں، اور یہ سب کچھ حاصل ہونا ایک بڑی جماعت کی معیت میں بظاہر مشکل نظر آرہا تھا، لہٰذا احقر نے اس جماعت کے ساتھ جانے سے معذرت کرلی۔

ماہِ رجب میں اسباق کا اختتام اور دیوبند کا سفر

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے احقر نے ۴؍رجب ۱۴۳۵ھ مطابق ۴؍مئی ۲۰۱۴ء بروز اتوار اپنے اسباق ختم کراکر دعا کرائی اور اگلے دن ۵؍رجب ۱۴۳۵ھ مطابق ۵؍مئی ۲۰۱۴ء بروز پیر بذریعہ پی۔آئی۔اے کراچی سے پاکستانی ٹائم کے مطابق صبح آٹھ بج کر پچپن منٹ پر دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً پونے دو گھنٹے میں ہندوستانی ٹائم کے مطابق گیارہ بج کر دس منٹ پر دہلی ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم کو اپنے پروگرام کی پیشگی اطلاع کردی تھی جس پر حضرت نے ''مرحبا'' کہہ کر خوشی کا اظہار فرمایا تھا اور یہ بھی کہ مذکورہ تاریخ کو دہلی ایئرپورٹ پر آپ کا استقبال کیا جائے گا۔

دہلی ایئرپورٹ پہنچ کر مختصر وقت میں جب قانونی کارروائی سے فارغ ہوکر باہر

آیا تو جناب مولانا محمد سراج صاحب قاسمی ذمہ دار دفتر جمعیت علمائے ہند دہلی، حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم کے حکم سے حضرت ہی کی گاڑی اور ڈرائیور سمیت انتظار کر رہے تھے، اور حضرت والا چونکہ اسباق کی مصروفیت کی وجہ سے خود دیوبند میں تھے، اس لیے مولانا محمد سراج صاحب سے بذریعۂ فون برابر معلوم فرماتے رہے کہ امام صاحب (احقر کو احاطۂ دار العلوم دیوبند میں امام صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) پہنچے یا نہیں؟ اور جب احقر مولانا محمد سراج صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس وقت بھی حضرت والا کا فون آیا کہ کیا ہوا؟ مولانا نے جب یہ جواب دیا کہ پہنچ گئے، میرے ساتھ ہیں تو حضرت نے فرمایا کہ بات کرا دیجیے۔ جب میں نے فون لیا تو حضرت والا کی مشفقانہ اور پُراثر آواز میں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' سن کر دل باغ باغ ہوگیا۔ حضرت والا نے خیریت کے ساتھ پہنچنے پر خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ آپ کا کھانا جمعیت کے دفتر میں تیار ہے، آپ ظہر پڑھ کر کھانا کھائیں، اس کے بعد آپ کی مرضی ہے، چاہیں تو آج دہلی میں آرام کریں، کل دیوبند آجائیں، چاہیں قیلولہ کر کے آج ہی آجائیں، مولانا محمد سراج صاحب گاڑی اور ڈرائیور سمیت آپ کے ساتھ ہوں گے۔ احقر نے عرض کیا کہ اب جب دیوبند جانے کی صورت بن رہی ہے تو دہلی میں آرام کیسے ملے گا؟

بہر صورت! ایئرپورٹ سے مولانا محمد سراج صاحب کے ساتھ دفترِ جمعیت پہنچے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب سیکریٹری جمعیت نے بہت اکرام کیا۔ ظہر کی نماز کے بعد کھانا کھا کر اپنی عادت کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے قیلولہ کرنے کی غرض سے لیٹا، لیکن دیوبند کی محبت وتڑپ میں سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو رہا تھا اور بقول شاعر:

منزلِ یار چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

محبت و وصال کے جذبات میں اضافہ ہو رہا تھا، لہٰذا اُٹھ کر مولانا محمد سراج صاحب سے عرض کیا کہ دیوبند چلنا ہے۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، فوراً تیار ہوئے اور ڈرائیور محمد یاسین صاحب اور ان کے ایک اور ساتھی اور احقر کو ساتھ لے کر دیوبند روانہ ہوئے۔ عصر کے وقت دیوبند- جو کہ دہلی سے تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے- کے حدود میں داخل ہو گئے، اور یہ خیال کر کے کہ دارالعلوم پہنچتے پہنچتے کہیں عصر کی نماز میں تاخیر نہ ہو جائے اس لیے نماز پڑھنے کے لیے مین روڈ کے کنارہ پر واقع ایک مدرسہ ''جامعہ زکریا'' کی مسجد کے ساتھ رُک گئے۔ وضو کر کے احقر جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا تو وہاں پر موجود مدرسہ کے مہتمم صاحب نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور بے حد احترام سے پیش آئے اور فرمایا کہ جب آپ دارالعلوم میں بحیثیت مدرس و امام فرائض انجام دے رہے تھے اس زمانہ میں' میں پڑھتا تھا۔ انہوں نے اکرام کرنا بھی چاہا، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ہم نے معذرت کر لی اور نماز پڑھ کر دارالعلوم کی طرف روانہ ہو گئے۔

دارالعلوم کے قریب ''محلہ خانقاہ'' میں جب داخل ہوئے تو طلبۂ عزیز حسبِ معمول بعد العصر چہل قدمی کے لیے گلیوں سے گزر رہے تھے اور ہر ملنے والے کو سلام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چہروں پر نور و وقار، چلنے میں سادگی اور نگاہوں کو نیچے کیے ہوئے چل رہے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انسانوں کی شکل میں فرشتے چل رہے ہیں۔ مجھے ان کو دیکھ کر ۲۳ / سال پہلے کا وہ دور یاد آ رہا تھا جب مجھ جیسا سیاہ کار بھی بعد العصر اسی سرزمین پر چہل قدمی کے لیے نکلا کرتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم کے

مکان پر پہنچ گئے۔ رفیقِ سفر مولانا محمد سراج صاحب کا چونکہ حضرت والا سے برابر بذریعۂ فون رابطہ قائم تھا، اس لیے حضرت کو یہ معلوم تھا کہ ہم پہنچنے والے ہیں اور وہ انتظار میں تھے، جیسے ہی ہم ان کے مکان میں پہنچے تو وہ بے حد شفقت و محبت سے ملے اور سبز چائے – جو بالعموم عصر کے بعد ان کی مجلس میں چلتی رہتی ہے – پیش فرمائی، اور حال و احوال پوچھنے کے بعد فرمایا کہ آپ کا قیام دارالعلوم کے مہمان خانہ میں ہوگا۔ البتہ جب تک آپ کا قیام ہوگا صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا میرے یہاں ہوگا۔ ہاں! اگر کسی نے دعوت کی اور آپ نے قبول کر لی تو وہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے، اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ چونکہ میرے کچھ پروگرام طے شدہ ہیں تو میں اگر کسی دن دیوبند میں نہ بھی رہا، تب بھی یہ گھر آپ کا ہے، میرے صاحبزادے (مولانا سید امجد مدنی فاضل دارالعلوم دیوبند حفظہ اللہ) آپ سے برابر رابطہ میں رہیں گے۔

مغرب کی نماز سے پہلے میرا سامان کمرہ نمبر: ۱۱ مہمان خانہ دارالعلوم دیوبند منتقل کیا گیا۔ کمرہ کافی کشادہ، آرام دہ اور ایئر کنڈیشنڈ پر مشتمل تھا۔ سامان رکھ کر کمرہ کی چابی میرے حوالہ کی گئی، اور میں دارالعلوم کی مسجد قدیم میں مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے جیسے ہی مہمان خانہ سے نکلا، اسی وقت دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے بہت ہی خوشی اور محبت کا اظہار فرمایا، مغرب کی نماز مسجد قدیم – جس کی امامت و خطابت کی ذمہ داری تقریباً دس سال تک احقر کے سپرد رہی تھی – ادا کی۔ مغرب کے بعد دارالعلوم کے احاطہ میں گھومتا ہوا پرانی یادیں تازہ کرتا رہا۔ کمرہ نمبر: ۱۱ ''احاطۂ باغ'' جس

میں احقر کا قیام رہتا تھا وہاں بھی پہنچا، لیکن وہ کمرہ حال ہی میں جدید تعمیری نقشہ میں آکر منہدم کر دیا گیا تھا، صرف بنیادوں اور محل وقوع کی زیارت نصیب ہوئی۔ دارِ جدید کی عمارت مدنی گیٹ سے معراج گیٹ تک منہدم ہو کر نئے سہ منزلہ نقشہ کے مطابق تعمیر کی جا چکی تھی جس میں صرف ''باب الظاہر'' درمیان میں پرانی حالت پر باقی تھا۔ مدنی گیٹ سے احاطۂ باغ تک کا حصہ بھی منہدم ہو چکا تھا، اور نئے نقشہ کے مطابق بنیادوں کی کھدائی کا کام جاری تھا۔ معراج گیٹ سے نو درہ تک کا حصہ پرانی حالت میں تھا، لیکن اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

طویل فراق کے بعد اپنی مادرِ علمی کے احاطہ میں گھومتا ہوا بار بار یہ تسلی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج میں حقیقۃً اپنی روحانی ماں کی آغوشِ رحمت میں پہنچ چکا ہوں، اور یہ کوئی خواب یا صرف تصور ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میرے طویل فراق کو وصال سے تبدیل کر دیا ہے۔

آن پریشانی شبہائے دراز و غمِ دل
ہمہ در سایۂ گیسوئی نگار آخر شد

دارالعلوم کے احاطہ میں ایک مختصر گشت کرنے کے بعد واپس حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ کر ان کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ حضرت والا نے احقر کی دلجوئی کے لیے میرے بے تکلف دوست جناب مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب استاذِ حدیث و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور چند دیگر حضرات کو بھی کھانے پر مدعو کیا تھا، کھانے کے بعد دارالعلوم کی عالی شان مسجد جدید ''جامع مسجد رشید'' میں عشاء کی نماز پڑھی، اس مسجد سے بھی احقر کی یادیں وابستہ ہیں۔

جامع مسجد رشید کا تذکرہ

احقر کو اچھی طرح یاد ہے کہ بروز جمعہ ۲۳/ ۷/ ۱۴۰۶ھ مطابق ۴/ ۴/ ۱۹۸۶ء اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس میں دار العلوم دیو بند کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب قدس سرہٗ، بڑے اساتذہ بالخصوص حضرت الاستاذ مرشدی مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ اور بعض معزز مہمان جیسے حضرت حکیم عبدالرشید محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ (عرف حکیم نومیاں) اور حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے شرکت کی۔ احقر اس وقت دار العلوم میں تدریس اور مسجد قدیم کی امامت و خطابت کی ذمہ داری انجام دے رہا تھا اور اس بابرکت تقریب میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

جب سنگِ بنیاد رکھا گیا اور اس کے بعد بنیادوں کی کھدائی اور باقاعدہ تعمیری کام کا آغاز ہوا تو حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر پر اعتماد کرتے ہوئے اس مسجد کی نگرانی اور تعمیری سامان کی دیکھ بھال ایک اضافی کام کے طور پر احقر کے سپرد کرنا چاہی، احقر نے کافی معذرت بھی کی اور عرض کیا کہ مجھے تدریس کے علاوہ اس جیسے کاموں کا نہ تو کوئی تجربہ ہے اور نہ ہی دلچسپی، لیکن انہوں نے اصرار فرماتے ہوئے کہا کہ یہ دار العلوم کی خدمت ہے اور آپ پر اعتماد ہے، آپ اس کو قبول کیجئے، اور ساتھ ساتھ دار العلوم کے لیٹر پیڈ پر احقر کے نام ایک تحریر ارسال فرمادی، جس میں سلام کے بعد مندرجہ ذیل مضمون درج تھا:

”الحمد للہ! تعمیر مسجد دار العلوم کا کام شروع ہوگیا ہے۔ کام منظور شدہ ٹھیکیداران کے ذریعہ کرایا جارہا ہے۔ تکنیکی نگرانی انجینئر اور آرکٹیکٹ صاحبان فرمارہے ہیں۔ مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں عمارتی سامان ادارے کی جانب سے فراہم کیا

جارہا ہے۔اس سلسلہ میں نگرانی کے فرائض آپ کو تفویض کیے جاتے ہیں۔موقع پر جو سامان آئے اس کا اندراج رجسٹروں میں باقاعدہ طور پر اپنی نگرانی میں کرا کر آپ بلوں پر تصدیق فرمائیں۔عمارتی سامان کی کوالٹی،مقدار اور تعداد کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔اس امر کی جانب بھی توجہ فرمائیں کہ کوئی سامان کسی بھی صورت میں خورد برد نہ ہو سکے۔شعبہ جات متعلقہ اس سلسلہ میں آپ سے مکمل تعاون کریں گے۔نقولات' شعبہ جاتِ محاسبی، دارالاقامہ، اور تعمیرات کو بغرضِ اطلاع اور ضروری کارروائی ارسال ہیں۔

نوٹ: اعظمی منزل اور دیگر زیرِ تعمیر کاموں کی نگرانی بھی آپ کے سپرد کی جاتی ہے۔''

مرغوب الرحمن

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۴/ ۸/ ۱۴۰۷ء

اس تحریر کے بعد معذرت کا راستہ بند ہو گیا اور احقر نے حسب الحکم نگرانی شروع کی، لیکن چند ہی دن کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔مطالعہ میں دشواری ہو رہی ہے اور اسباق کی تیاری میں فرق محسوس ہو رہا ہے، تو میں نے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ حضرت! آپ کے حکم کے مطابق میں نے یہ کام شروع تو کر دیا، لیکن اب مجھے پورا اندازہ ہو گیا کہ یہ میرے بس سے باہر ہے، لہٰذا براہِ کرم اس کام سے میری معذرت منظور فرمالیں۔اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، انہوں نے میری معذرت منظور فرما کر اس کام کو جناب مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی (موجودہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے سپرد کر دیا، جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت، مسلسل محنت اور ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۰۰۳ء تک بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

کچھ تذکرہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کے بارے میں

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم العالی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے صاحبزادے، دارالعلوم دیوبند کے استاذِ حدیث اور جمعیت علمائے ہند کے صدر ہیں۔ حضرت والا سے احقر کو پڑھنے کی سعادت میسر نہ ہوسکی، اس لیے کہ جس وقت حضرت والا کو مدرسہ شاہی مرادآباد سے استاذِ حدیث کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند بلایا گیا اس وقت احقر دارالعلوم سے فارغ ہوکر مدرس بھی بن گیا تھا، البتہ حضرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع خوب ملا، ان کی عظمت وہمت، تقویٰ وطہارت، سخاوت وتواضع، ذہانت وصلاحیت، شجاعت وبلند اخلاق اور بااثر شخصیت کا ہمیشہ معترف ومعتقد رہا، اور استاذ ہی کی طرح ان کا احترام میرے دل میں جاگزیں رہا۔

علمی وانتظامی صلاحیت

حضرت والا نے دارالعلوم میں استاذِ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ نظامتِ تعلیمات کا عہدہ بھی ایک عرصہ تک سنبھالا، اور تعلیم وتربیت کی بہتری کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ فجر کی نماز کے لیے اذان کے بعد ہی ٹارچ لے کر پورے دارالعلوم

کے طلبہ کو جگانا آپ کا معمول تھا، چنانچہ نماز شروع ہونے سے پہلے پوری مسجد طلبہ سے بھر جاتی تھی۔ علمی قابلیت کے ثبوت کے لیے دارالعلوم دیوبند میں حدیث پڑھانا اور نظامتِ تعلیمات کا عہدہ سنبھالنا ہی کافی ہے۔ اس کے علاوہ علّامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۸۵۵ھ) کی ۲۳/جلدوں پر مشتمل مایۂ نازتصنیف ''نخب الأفكارفي تنقيح مباني الأخبار'' جو امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۲۱ھ) کی مشہور کتاب ''شرح معاني الآثار'' کی شرح ہے اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم کی محنت و تحقیق کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم کے لیے ایک بہترین علمی تحفہ ثابت ہوئی تو یہ حضرت والا کی اعلیٰ قابلیت وصلاحیت کا شاہدِ عدل ہے۔

سفر وحضر میں تہجُّد کی پابندی

تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ احقر کے علم کے مطابق سفر وحضر میں تہجد اور قبولیت کی گھڑیوں میں اللہ تعالیٰ کو پکارنے کا معمول برابر قائم رہتا ہے، اس سلسلہ کا ایک چشم دید واقعہ قلمبند کرتا ہوں:

> ''شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ کے ایک داماد جناب بھائی نعیم صاحب خانجہانپوری ہر سال آم کے موسم میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہم اور مدنی خاندان کے دوسرے افراد و چند متعلقین کی ایک پر تکلف دعوت کیا کرتے تھے، جس میں بہترین کھانے کے ساتھ ساتھ اپنے باغ کے ذائقہ دار آم بھی کھلاتے تھے۔ اس دعوت میں اکثر احقر کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ رات کا قیام ان کے کشادہ مکان میں مہمانوں کے لیے مختص حصہ میں ہوا کرتا تھا، جس میں چند کمروں کے

ساتھ ایک کشادہ برآمدہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آم کے موسم میں حسب معمول بھائی نعیم صاحب نے دعوت کی اور بروز اتوار ۲۱/ ذو الحجہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۵/ جولائی ۱۹۹۰ء حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم، ان کے چند متعلقین اور احقر خانجہانپور پہنچے۔ رات کو کھانا اور آم کھانے کے بعد جب ہم سب آرام کے لیے مہمان خانہ میں لیٹ گئے تو تہجد کے وقت احقر نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے دیکھا کہ حضرت والا آہستہ آہستہ اٹھ کر مکان کے دوسرے حصہ میں وضو کر کے آرام کرنے والوں سے ذرا دور ہو کر برآمدے کے ایک کونے میں نمازِ تہجد میں مصروف ہو گئے، اور اتنی بلند آواز سے تلاوت کرتے رہے کہ سونے والوں کی نیند میں فرق نہ آنے پائے، میری آنکھیں چونکہ پہلے ہی کھل چکی تھیں اور حضرت کے اس قابلِ رشک عمل کے تجسس میں کانوں سمیت لگی ہوئی تھیں، اس لیے مجھ سے یہ عمل پوشیدہ نہ رہ سکا، البتہ تجاہل عارفانہ اختیار کرتا ہوا حضرت والا کو یہ نہیں محسوس ہونے دیا کہ میں وضو سے لے کر باا ثر تلاوتِ قرآن تک پورے اس عملِ خیر کا رشک کے ساتھ جائزہ لے رہا ہوں۔ اُس وقت تو یہ بھی میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ کونسی سورت و پارہ پڑھ رہے تھے، البتہ اب وہ یاد نہیں رہا، یہ ضرور یاد ہے کہ کافی لمبی تلاوت فرمائی اور آخر میں دعا پر اپنا معمول پورا کیا۔"

مولانا کی ہمت و شجاعت اور ایک اہم واقعہ

ہمت و شجاعت سے متعلق ان کا یہ واقعہ میں بھول نہیں سکتا کہ ۲۱/ دسمبر ۱۹۸۳ھ مطابق ۱۵/ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ بروز بدھ دس تا بارہ افراد پر مشتمل ایک شر پسند ٹولے (جن کا اپنی شرارتوں کی وجہ سے دارالعلوم سے اخراج ہو گیا تھا) نے دارالعلوم پر قبضہ کرنے کے لیے ظہر کی نماز کے بعد مسلح حملہ کر دیا، اور جنوبی دروازہ سے فائرنگ کرتے ہوئے داخل ہو گئے اور پورے دارالعلوم میں سخت خوف و

ہراس پھیلا دیا، اس موقع پر شیخ الاسلامؒ کے بہادر صاحبزادے حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب اپنی لائسنس یافتہ بندوق کے ساتھ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر شرپسندوں کے مقابلہ کے لیے دارالعلوم میں داخل ہوئے اور جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدیر ماہنامہ دارالعلوم کے ساتھ مل کر ان مسلح افراد کا مقابلہ شروع کیا، ان کو دیکھ کر نہتے طلبہ کی جان میں جان آگئی اور ان کا ساتھ دیا اور بحمد اللہ مختصر وقت میں وہ ٹولہ پسپا ہوا، کچھ تو بھاگ گئے اور کچھ پکڑے گئے جن کی زبردست دُھلائی ہوئی اور پھر حضرت والا اور چند دیگر اساتذہ نے ان کی جانیں بچائیں، ورنہ دارالعلوم کے مشتعل طلبہ شاید ان کو زندہ نہ چھوڑتے۔

اس موجودہ سفر میں بھی احقر نے ایک سے زائد مرتبہ دیکھا کہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب صبح ترمذی شریف کا سبق پڑھا کر جمعیت علمائے ہند کی طرف سے مختلف مقامات پر طے شدہ پروگراموں میں شرکت کر کے تقریر فرماتے ہیں، رات کو دہلی پہنچ کر نماز و کھانے سے فارغ ہو کر کچھ آرام کرتے ہیں، رات کے آخری حصہ میں اٹھ کر تہجد کا اپنا مستقل معمول پورا کرتے ہیں اور پھر دہلی سے روانہ ہو کر صبح دیوبند پہنچ کر اپنا سبق پڑھاتے ہیں۔ ایک اور خاص بات جو احقر نے واضح طور پر محسوس کی، وہ یہ تھی کہ بڑھاپے اور اتنی مصروفیات کے باوجود نہ تو ان کے چہرہ پر تھکاوٹ کے آثار محسوس ہوتے تھے اور نہ ہی اندازِ گفتگو میں کوئی فرق، بلکہ ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ ہر ایک سے ملنا اور ہر ملنے والے سے نہایت اطمینان و اپنائیت کے ساتھ گفتگو اور مزاج پرسی کا سلسلہ برقرار رہتا تھا۔ اتنی مصروفیات و بڑھاپے کے باوجود اپنے اعصاب و حواس پر اتنا کنٹرول اور اپنی زبان کی شیرینی و نرمی کو اس حد تک قابو میں رکھنا کم از کم احقر نے تو اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ہے، اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے علاوہ اپنے اکابرین میں سے کسی سے متعلق سنا بھی نہیں ہے۔

مسلمانانِ ہند کے مسائل سے گہری دلچسپی

مسلمانانِ ہند کے عمومی مسائل کے حل کے لیے حضرت والا کی سرگرمیوں اور دلچسپی سے متعلق ایک واقعہ جو اس سفر کے دوران میرے علم میں آیا، نمونہ کے طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ انتہاء پسند ہندوؤں نے پانچ تا سات بے گناہ مسلمان افراد پر گجرات میں ''اکشر دھام'' حملہ کا الزام لگا کر مقدمہ قائم کر دیا، جس کے بعد ہائی کورٹ گجرات نے ان کو پھانسی کی سزا سنائی۔ جمعیت علمائے ہند نے حضرت مولانا مدظلہم کی سرکردگی میں اس فیصلہ کو سپریم کورٹ آف انڈیا میں چیلنج کیا اور مقدمہ کی مکمل پیروی کی۔ اللہ کے فضل وکرم اور حضرت کی ذاتی دلچسپی کے باعث سپریم کورٹ نے اپنے اصولی فیصلہ کے تحت ہائی کورٹ کی سزا کو کالعدم قرار دے کر ان بے گناہ افراد کو باعزت بری کر دیا۔ اس کے بعد جمعیت نے بروز منگل ۲۰/ ۵/ ۲۰۱۴ء کو دہلی میں مذکورہ بری شدہ افراد کی موجودگی میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں حضرت مولانا نے خطاب کیا اور حقائق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان بے گناہ افراد کو غیر قانونی طریقہ سے ملوث قرار دینے والے افسران کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مطالبہ بھی کیا۔ اس واقعہ سے مسلمانانِ ہند کے عمومی مسائل سے متعلق حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی بے انتہاء ذاتی دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم کی خدمت میں حاضری اور ان کا ذکرِ خیر

جامع مسجد رشید میں نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد چونکہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی مناسب تھا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم شیخ

الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیو بند کی ملاقات کے لیے کل کا انتظار کروں۔ عشاء کی نماز کے بعد ہی حضرت کی خدمت میں ان کے ذاتی مکان پر- جو دار العلوم سے آٹھ دس منٹ کے فاصلے پر واقع ہے- حاضری دی۔ حضرت الاستاذ سے احقر کو بے انتہاء محبت وعقیدت ہے، اس لیے کہ احقر نے اپنی تعلیمی زندگی میں سب سے زیادہ استفادہ ان ہی سے کیا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس سال (تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ) احقر نے دار العلوم دیو بند میں دورۂ حدیث کیا، اس سال حضرت والا نے مندرجہ ذیل تمام کتابیں پڑھائیں:

بخاری شریف جلد ثانی　ترمذی شریف جلد اول　سنن ابوداؤد
صحیح مسلم (چند اسباق کے علاوہ)　مؤطا امام مالک　مؤطا امام محمد
شمائل ترمذی

اور اگلے سال جب احقر نے شعبۂ افتاء (تخصص فی الفقہ) میں داخلہ لیا تو اس سال بھی حضرت والا سے خارجی طور پر کافی استفادہ کیا اور سب سے بڑھ کر حضرت والا کی ایک خصوصی شفقت وعنایت یہ رہی کہ جب احقر کا مدرس کی حیثیت سے دار العلوم میں تقرر ہوا اور ایک دو سال پڑھانے کے بعد شدت کے ساتھ یہ احساس ہونے لگا کہ کاش! میں حافظ قرآن ہوتا! اس لیے کہ مدرس کے لیے حافظ قرآن ہونا نہایت اہم ہے اور ویسے بھی یہ ایک عظیم نعمت ہے جس سے میں محروم ہوں، چنانچہ حضرت والا ہی کے مشورہ سے تدریس کے ساتھ ساتھ حفظِ قرآن ان ہی کے پاس شروع کیا اور ان کی صحیح رہنمائی، فیض وبرکت اور خصوصی عنایت سے تقریباً ایک سال کے اندر حفظِ قرآن مکمل ہوگیا، اس کے علاوہ جب تک دار العلوم

میں تدریس کا سلسلہ رہا تو قدم قدم پر ان کی رہنمائی وسرپرستی حاصل رہی۔ دارالعلوم سے کراچی منتقل ہونے کے بعد بھی آج تک ان سے علمی اور دیگر اہم ومشورہ طلب امور میں استفادہ کا سلسلہ ٹیلی فون، خط وکتابت اور ان کی تصانیف کے ذریعہ قائم ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ ایک حقیقی بیٹے کو اپنے مشفق والد کی طرف سے اس سے زیادہ شفقت وذرہ نوازی کی سعادت حاصل نہیں رہی ہوگی جتنی شفقت سے حضرت الاستاذ نے اس نالائق شاگرد کو نوازا ہے اور آج تک نواز رہے ہیں۔

أللّٰهم بارك فى حياته مع الصحة والعافية -

حضرت مفتی صاحب مدظلہم العالی کا ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء کو دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا، انہوں نے دارالعلوم کی اس خدمت کو سعادت سمجھ کر اپنی تمام صلاحیتوں کو تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور اصلاحِ طلبہ پر لگایا۔معاشی دشواریاں بھی پیش آئیں، لیکن انہوں نے صبر واستقامت کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اپنے علمی کاموں میں ان دشواریوں کو حائل نہیں ہونے دیا اور نہ ہی کسی غیر علمی مصروفیت کی طرف متوجہ ہوئے۔مفتی صاحب کی خداداد صلاحیتوں، طلبہ میں بے پناہ مقبولیت اور علمی یکسوئی کو دیکھ کر مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے باوقار واعلیٰ علمی منصب پر فائز کردیا۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ دامت برکاتہم سے خوب کام لیا۔آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کی مشہور ومعروف کتاب ''حجة الله البالغة'' کی شرح ''رحمة الله الواسعة'' کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی جس نے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت

حاصل کرلی، یہاں تک کہ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۳، ۱۴؍صفر ۱۴۲۵ھ نے اس کتاب سے متعلق ایک تحریری تجویز پاس کی جس میں حضرت مفتی صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کو پوری جماعت کی طرف سے شکریہ و تحسین کا مستحق قرار دیا ہے۔ اسی طرح آپ نے ''تحفة الألمعی شرح سنن الترمذی'' کے نام سے سنن ترمذی کی اردو شرح تحریر فرمائی جو آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے، اور چونکہ اردو زبان میں ترمذی شریف کی یہ پہلی مکمل شرح ہے جس میں پوری کتاب بشمول ''کتاب العلل''، ''شمائل ترمذی'' کی تشریح کی گئی ہے، اس لیے اساتذۂ کرام اور طلبۂ عزیز کے درمیان اس کی خوب پذیرائی ہوئی، ''تحفة الألمعی'' کی تکمیل کے بعد حضرت الاستاذ نے بخاری شریف کی شرح ''تحفة القاری'' کے نام سے لکھنا شروع فرمائی جس کی تا دمِ تحریر گیارہ جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں، اور بارہویں و آخری جلد کا کام جاری ہے۔ (۱) اللہ تعالیٰ حضرت والا کو صحت و عافیت کے ساتھ اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ مذکورہ تصانیف کے علاوہ حضرت الاستاذ مدظلہم نے دیگر بھی متعدد تصانیف تحریر فرمائی ہیں جو مقبول عام و خاص بن چکی ہیں۔

حضرت الاستاذ کی قناعت و استغناء

تقویٰ و طہارت، اخلاص و للّٰہیت اور قناعت و استغناء میں حضرت الاستاذ مدظلہم نے اکابر کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ ۱۳۹۳ھ کو جب دار العلوم دیوبند میں ایک معمولی مشاہرہ پر ان کا تقرر عمل میں آیا تو صبر و قناعت کے ساتھ اس پر اکتفا کرتے

---

۱) الحمدللہ بارہویں اور آخری جلد بھی ماہِ رجب ۱۴۳۶ھ کو شائع ہو کر منظرِ عام پر آ گئی۔

ہوئے دارالعلوم کی خدمت کو جاری رکھا، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تصانیف کو خوب مقبولیت عطا کی اور اپنے ذاتی کتب خانہ ''مکتبۂ حجاز'' سے بقدرِ ضرورت ایک آمدنی کا سلسلہ بن گیا تو انہوں نے ۱۴۲۳ھ کو حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینے کا سلسلہ موقوف کر دیا اور جو تنخواہ ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۲۳ھ تک وصول فرما چکے تھے وہ بھی واپس لوٹا دی، بلکہ دارالعلوم دیوبند میں تقرری سے قبل ''دارالعلوم اشرفیہ'' راندیر میں جو نو سال تک ایک مقررہ مشاہرہ پر تدریسی خدمت انجام دے چکے تھے، ان نو سالوں کی تنخواہ بھی دارالعلوم اشرفیہ کو لوٹا دی۔

بہر حال! اس مختصر سفر کے موقع پر جب پہلے ہی دن عشاء کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری ہوئی تو انہوں نے بڑی شفقت وخوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: جب تک تم دیوبند میں ہو دوپہر کا کھانا ظہر کے بعد اور رات کا کھانا عشاء کے بعد میرے ساتھ کھانا، تاکہ کھانے کے بہانے ملاقات ہوتی رہے اور روزانہ عصر سے مغرب تک بھی میرے پاس رہنا۔ احقر نے کھانے سے متعلق تو اس لیے معذرت کر دی کہ کھانے کی بات پہلے ہی حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم سے ہو چکی تھی، البتہ عصر کے بعد حاضری کی اجازت کو اپنے لیے نعمتِ عظمیٰ تصور کرتا ہوا روزانہ حاضری کا عزم ظاہر کر دیا، چنانچہ روزانہ بعد العصر حضرت الاستاذ کی مجلس میں حاضر ہوتا رہا اور ان کے علمی واصلاحی ملفوظات سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مزید برآں! ۶ر رجب بروز منگل حضرت والا کے درسِ بخاری شریف میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی جو حضرت نے ''کتاب

الشروط'' کے اندر ''باب الشروط فی المهر عند عقدة النكاح''
(ج:۱،ص:۳۷۶) سے پڑھایا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہر مجلس و درس میں
شرکت کے موقع پر مندرجۂ ذیل شعر میں بیان کردہ حقیقت سامنے آتی رہی:

صحبتِ نیکان اگر یک ساعت است
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

حضرت الاستاذ سے خصوصی اجازتِ حدیث کی درخواست

اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ احقر نے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم العالی کے پاس حدیث کی کئی اہم کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے، مزید یہ بھی کہ دارالعلوم دیوبند سے احقر کی سندِ فراغت پر بھی آپ اور دیگر اساتذۂ کرام کے دستخط موجود ہیں جو اجازتِ حدیث کے لیے کافی ہیں، تاہم میری ایک قلبی خواہش ضرور تھی کہ حضرت الاستاذ ایک خصوصی مختصر اجازت نامہ تحریری طور پر مزید عنایت فرمادیں جس میں ان کی تمام مرویات کی اجازت شامل ہو، چنانچہ اس سفر میں ایک دن میں نے اس درخواست کی جسارت کر ہی دی، حضرت نے فرمایا کہ ضرور دیں گے۔ میرا خیال یہی تھا کہ حضرت الاستاذ سادہ کاغذ پر مختصر الفاظ میں تین چار سطر تحریر فرما کر عنایت فرمائیں گے اور وہی مختصر تحریر میرے لیے عظیم سعادت ہوگی، لیکن میری حیرت کی انتہاء نہ رہی بلکہ میرا سر شرم سے جھک گیا جب اگلے دن بعد العصر ان کی خدمت میں حاضری ہوئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک مفصل اجازت نامہ تحریر فرما کر ایک خوبصورت کاغذ پر جس کے حواشی پر رنگارنگ پھولوں کے نقوش چھپے ہوئے ہیں کاتب سے منتقل کروادیا ہے

اور نیچے دستخط فرما کر اس کمترین شاگرد کو عنایت فرمائیں گے۔

اس اجازت نامہ میں حضرت الاستاذ (أَمَدَّ اللّٰہُ في عمره وصحته وجهوده) نے اس حقیر خادم کا جس انداز پر ذکر فرمایا ہے، احقر اس کو اپنے لیے نیک فال ضرور سمجھتا ہے، لیکن اپنے آپ کو اس کا مستحق ہرگز نہیں سمجھتا، بلکہ یہ تصور کرتا ہے کہ حضرت والا نے اپنے انداز سے اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہوئے اس کی ہمت افزائی اور ذرّہ نوازی فرمائی ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي هدانا الدين الإسلام والاهتداء، والصلاة والسلام على خير خلقه سيد المرسلين وعلى آله وصحبه ذوي الدراية واليقين، أما بعد: فإن تلميذ الأمس زميل اليوم، الأستاذ الأديب الأريب، الشيخ المحدث، النبيه الكريم، العلامة حبيبي عبد الرؤوف خان الغزنوي الأفغاني مدرس الحديث الشريف بالجامعة الإسلامية بنوري تاؤن بكراتشي (الباكستان) قرأ عليّ عديدا من الكتب الحديثية، كصحيح البخاري، وصحيح مسلم، والجامع للإمام الترمذي وغيرها، وكان التصدي للإقراء هو الإجازة، ولكنه استجاز مني مرة أخرى، لحسن ظنه بي، ولست بأهل لذلك، فما كل بيضاء شحمة، ولا كل ذات ورم سمينة، ولكن حسن ظنه هو غاية آمالي، فاقتداء بالسلف الصالح أجيزه برواية جميع الكتب الحديثية معروفة الأسانيد لدى تلاميذي، مثل الصحيحين، والسنن الأربعة، وشرح معاني الآثار، والموطئين للإمامين الهمامين: مالك ومحمد، ومسند الإمام الأعظم، ومسند الإمام أحمد بن حنبل رحمهم الله، وأدعو الله تعالى أن يوفقه ويرضى، ويذيقه حلاوة العلم والمعرفة والتحقيق، ويبلغه غاية ما يتمناه.

وأوصيه بتقوى الله تعالى في السر والعلن، وان يتبع سنة سيد المرسلين، وأرجو منه أن لا ينساني في دعواته الصالحة، ويوفقني وإياه لمرضاته ولصالح الاعمال، فانه ولي التوفيق، والحمد لله رب العالمين، وصلى الله على سيدنا سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وصحبه أجمعين، آمين يا رب العالمين

أجازه العبد الفقير الحقير

١٠/٧/١٤٣٥هـ
١٠/٥/٢٠١٤م

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب کی خدمت میں حاضری اور ان کا ذکرِ خیر

دار العلوم دیوبند میں احقر کے اساتذۂ کرام میں سے تین حضرات بقیدِ حیات ہیں (أللّٰهم بارك في حياتهم وصحتهم وجهودهم) ایک حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم جن کا تذکرۂ خیر ہو چکا ہے، دوسرے حضرت الاستاذ مولانا قمرالدین صاحب مدظلہم العالی جن کا ذکرِ خیر آرہا ہے اور تیسرے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری زیدمجدہم ہیں۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری سے احقر نے سنن ابن ماجہ پڑھی ہے۔ اللہ نے ان کو گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ تقویٰ وطہارت کے ساتھ ساتھ ذہانت وفطانت، فصاحت وبلاغت، شعرگوئی وبذلہ سنجی اور معاملہ فہمی وحاضر جوابی میں ثانی نہیں رکھتے۔ تدریس کے دوران مختصر مگر جامع ونہایت سہل انداز میں موضوع پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ مضمون نگاری وتصنیف وتألیف کے میدان میں بھی قدرت نے ان کو خوب صلاحیت عطا کی ہے۔ ۱۳۹۱ھ کو دار العلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا اور ابتدائی درجات سے لے کر دورۂ حدیث وتکمیلات تک کی کتابیں کامیابی کے ساتھ پڑھائیں، آج کل دورۂ حدیث

کی ایک اہم کتاب ترمذی شریف جلد اول پڑھا رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کا مشہور و معروف ترانہ (یہ علم و ہنر کا گہوارہ۔۔۔۔) آپ ہی کی تخلیق اور آپ ہی کی پاکیزہ شاعری کا ترجمان ہے، جسے سن کر دلوں پر رقت طاری ہوتی ہے اور آنکھوں کو آنسو بہائے بغیر چین نہیں آتا۔ ''نغمۂ سحر'' کے نام سے آپ کے اشعار کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

تصنیف و تالیف کی صلاحیت

تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ کی ایک شاہکار تصنیف ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' ہے، جو اپنے موضوع پر ایک مفصل و مدلل کتاب ہے۔ یہ کتاب مجلس شوریٰ اور مہتمم کی باہمی حیثیت سے متعلق لکھی گئی ہے اور نصوصِ شرعیہ اور اسلافِ امت و اکابرین دارالعلوم دیوبند کی تصریحات کی روشنی میں شوریٰ کی بالادستی، مہتمم کو اس کے سامنے جواب دہ ہونا اور مجلس شوریٰ کا مہتمم کے نصب و عزل کا مختار ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۴۰۸ھ کو پہلی بار ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ''شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند'' کی طرف سے شائع ہوئی اور اس کو علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی و شہرت ملی۔ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہٗ، حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری موجودہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مدظلہم اور مشہور مصنف حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نگران

اعزازی ''شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند''، ان تمام اکابر نے اس کتاب پر اعتماد کا اظہار فرماتے ہوئے اس پر تصدیقات ثبت فرمادی ہیں۔

میدانِ تصنیف وتالیف میں ان کا دوسرا عظیم کارنامہ ''ایضاح البخاری'' شرح صحیح بخاری ہے جس میں انہوں نے اپنے استاذِ محترم فخر الاسلام حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (متوفّٰی ۱۳۹۲ھ) کے افادات کو اپنی مزید تحقیق، حسنِ ترتیب اور حوالوں کی نشاندہی کے ساتھ جمع فرمایا ہے اور اب تک اس کی آٹھ جلدیں (کتاب الوحی سے کتاب الاعتکاف کے اختتام تک) شائع ہوچکی ہیں اور آگے کا کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولاناؒ کی تحریر کی خصوصیات

خوش نویسی، زودنویسی، باریک نویسی اور صاف نویسی ان چاروں عناصر کا مجموعہ میں نے اپنی زندگی میں صرف انہی کی تحریروں میں دیکھا ہے، جب قلم ہاتھ میں لیتے ہیں تو روانی کے ساتھ خوبصورت چھوٹے حروف کے ساتھ موتیوں کی لڑیاں پرونے لگتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی کی تحریر میں خوش نویسی ہے تو زودنویسی اور باریک نویسی معدوم، اور زودنویسی یا باریک نویسی اگر موجود ہے تو صاف نویسی اور خوش نویسی ندارد، حضرت الاستاذ مدظلہم کی تحریروں میں بیک وقت یہ تمام اوصاف نظر آتے ہیں، کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک پورے مضمون کا خلاصہ لکھنا آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ آپ کی تحریر چاہے چند ہی سطروں پر مشتمل ہو اور صرف ایک وقتی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہو اگر کسی صاحبِ

ذوق کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کی ظاہری و باطنی خوبصورتی کی وجہ سے وہ ہمیشہ اس کی حفاظت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ صاحبِ ذوق کو تو چھوڑیئے! احقر جیسے مغفل طالب علم نے بھی آپ کی ہر تحریر کی حفاظت کی ہے، چنانچہ آپ کے زمانۂ نظامتِ تعلیمات میں کسی سبق کے ردو بدل یا اضافہ و کمی یا دیگر تعلیمی امور سے متعلق جو وقتی حکم یا اطلاع کے طور پر آپ کی مختصر تحریریں احقر کے نام لکھی گئی ہیں وہ سب آج تک احقر کی خصوصی فائل میں محفوظ ہیں، اور بالخصوص وہ خطوط جو آپ نے اس ادنیٰ شاگرد کے خطوط کے جوابات میں لکھے ہیں، وہ تو کحل البصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام تحریروں کو موقع بموقع کھول کر ان سے استفادہ اور اپنے استاذ محترم مدظلہم کی یادوں کو تازہ کرتا رہتا ہوں۔ آپ نے ایک عرصہ تک ناظمِ تعلیمات کی حیثیت سے بھی دارالعلوم دیوبند کی خدمت کی، اس دوران آپ کا معاملہ اساتذہ کے ساتھ ہو یا طلبہ کے ساتھ نہایت موزوں و مناسب ہوا کرتا تھا، کسی استاذ یا طالب علم کو ایسی شکایت کا موقع نہیں دیا کرتے جسے ''شکایتِ بجا'' کہا جا سکے، اسی طرح کچھ عرصہ تک تدریس کے ساتھ ساتھ ''ماہنامہ دارالعلوم'' کی ادارت کی ذمہ داری بھی کامیابی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کے حق میں ''مجمع الکمالات'' کا لفظ استعمال کرنا مبالغہ سے بالکل خالی تصور کیا جانا چاہیے۔

تواضع و خاکساری

مذکورہ تمام کمالات کے ساتھ ساتھ حضرت الاستاذ کا ایک امتیازی اور خصوصی کمال ان کی حقیقی تواضع اور بے پناہ خاکساری ہے جس سے احقر بے حد متاثر ہوا ہے، اس لیے کہ ظاہری تواضع کی مثالیں تو کافی ملتی ہیں، لیکن حقیقی تواضع اور وہ بھی

صاحبِ کمال بلکہ مجمع الکمالات شخص کے اندر پایا جانا بہت مشکل ہے۔ رواں ہجری صدی کے شروع میں جب راقم داخلہ کی غرض سے دارالعلوم دیوبند پہنچا اور حضرت والا سے پڑھنے کا موقع نصیب ہوا، اور ساتھ ساتھ آپ کو بحیثیت ناظمِ تعلیمات بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور دارالعلوم دیوبند سے میری جدائی کے بعد بھی آپ سے تعلق قائم رہا جو آج تک بحمد اللہ باقی ہے۔ اس طویل واقفیت کے بعد میں شرح صدر کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ تواضع کے جس مقام پر وہ فائز ہیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ظاہری تواضع کرنے والوں کی تواضع کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب ان کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، یا یہ کہ ان کے ہم پلہ اور کم درجہ کے لوگوں کو فوقیت دی جا رہی ہے، یا ان کے ساتھ ان کے مقام سے کم درجہ کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، تو اس وقت وہ سیخ پا ہونے لگتے ہیں اور مختلف طریقوں سے احتجاج کرنے پر اتر آتے ہیں اور تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لا کر اپنا مقام حاصل کرنے بلکہ اس سے بھی اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں، البتہ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ تو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو ملے ہوئے مقام سے بالاتر سمجھتے ہیں، بلکہ ملے ہوئے مقام کو اپنی حیثیت سے بالاتر سمجھ کر اللہ کا شکر بجالاتے ہیں، یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''من تواضع لله رفعه الله'' (جس نے اللہ کی رضا کے لیے تواضع اختیار کی اللہ اس کو بلندی عطا فرماتا ہے)۔

دارالعلوم دیوبند نے ماضی میں بھی ایسے بے شمار اللہ والے پیدا کیے ہیں اور اب بھی بحمد اللہ اس کے ماحول میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک حضرتِ ممدوح بھی ہیں، نمونہ کے طور پر ان کی حقیقی تواضع سے متعلق چند واقعات قلمبند کیے جا رہے ہیں:

پہلا واقعہ:

حضرت مولانا ریاست علی صاحب دامت برکاتہم سے احقر غائبانہ طور پر اس وقت سے واقف ہو چکا تھا جب وہ تعلیمی سال ۱۴۰۰ھ-۱۴۰۱ھ کو مدرسہ امینیہ دہلی میں درجہ موقوف علیہ کا طالب علم تھا، البتہ زیارت کا موقع نہیں مل سکا تھا، اور جب اگلے تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ کو دورۂ حدیث میں داخلہ لینے کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوئی تو داخلہ کے ایام میں ہی ایک نورانی چہرہ والے ادھیڑ عمر کے شخص کو دارالعلوم میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا جن کے سادہ لباس، بلاتکلف نقل وحرکت اور ہر ملنے والے کو سلام میں سبقت کرنے سے دل دل میں متأثر ہونے لگا تھا، اندازہ یہ تھا کہ یہ شخص دارالعلوم کے عام متعلقین میں سے کوئی ہوں گے جن پر بزرگوں کا رنگ چڑھا ہوا ہے، ان کی سادگی کو دیکھ کر یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ یہ دارالعلوم کے بڑے استاذ ہوں گے، بعد میں پتہ چلا کہ یہی حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدظلہم ہیں۔

دوسرا واقعہ:

ایک دفعہ دارالحدیث تحتانی دارالعلوم دیوبند میں ایک جلسہ (جلسہ انعامیہ یا کوئی اور جلسہ) منعقد ہوا جس میں اساتذہ وطلبہ سب شریک تھے، اساتذہ حسب معمول اسٹیج پر تشریف فرما تھے، جبکہ طلبہ سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا ریاست علی صاحب غالباً ذرا دیر سے پہنچے ہوں گے تو پیچھے سے اسٹیج پر خالی جگہ نہ دیکھ کر (حالانکہ جگہ آسانی سے نکل سکتی تھی) کسی کو احساس دلائے بغیر

ایک کونے میں جا کر طلبہ کی صفوں میں اس طرح خاموشی سے تشریف فرما ہوئے کہ حاضرین میں سے کسی کو آپ کی آمد کی خبر نہ ہوئی، راقم چونکہ اس وقت مدرس بن گیا تھا، اس لیے وہ بھی اسٹیج پر تھا، یاد پڑتا ہے کہ سب سے پہلے راقم ہی کی نظر پڑی اور بڑی شرمندگی ہوئی کہ ایک ادنیٰ شاگرد اسٹیج پر بیٹھا ہوا ہے اور استاذ الاساتذہ طلبہ کی صفوں میں!! تو سب سے پہلے احقر ہی نے حضرت والا سے اسٹیج پر آنے کی درخواست کی، اس دوران بڑے اساتذہ بھی متوجہ ہوئے اور ان کو اسٹیج پر بلایا، تب وہ تشریف لا کر اساتذہ کی صفوں میں تشریف فرما ہوئے۔

تیسرا واقعہ:

جس وقت آپ اپنی مایۂ ناز تصنیف ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' لکھ رہے تھے تو چند اکابر حضرات سے اس سلسلہ میں باقاعدہ ان کا تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور ان سے مشورے لیتے رہے، اور ایسا بھی ہوتا رہا کہ کبھی اپنے چھوٹوں اور شاگردوں سے کتاب کے کسی موضوع سے متعلق کوئی سرسری تبادلۂ خیال ہو جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صرف ایک ہی مرتبہ خود مجھ سے اس کتاب کے کسی موضوع سے متعلق کوئی سرسری تذکرہ فرمایا اور میری رائے دریافت کی، میں نے اپنی رائے ظاہر کردی جو درحقیقت حضرت ہی کی رائے کی تائید تھی۔ حضرت والا کی تواضع وحق بینی کا یہ عالم دیکھیے کہ مذکورہ کتاب کے شروع میں ''پیش لفظ'' کے تحت جہاں ان اکابر کا ذکر کیا ہے جن سے کتاب میں مدد لی گئی ہے وہاں ان اصاغر کا ذکر بھی فرمایا ہے جن سے تبادلۂ خیال کیا گیا ہے اور ان کے ضمن میں احقر کا نام بھی شامل کردیا ہے۔

اللہ ہدایت نصیب فرمائے ان مصنفین کو جو ''علمی سرقہ'' کرتے ہوئے دوسروں کی محنت وکاوش کو اپنا کارنامہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اوران کو بھی جو پورا کام یا اکثر کام دوسروں سے کرواتے ہیں اور نام صرف اپنا ہی لگالیتے ہیں۔ حضرت والا مدظلہم نے کلیدی محنت خود ہی انجام دی، البتہ ایک معمولی شرکت کی وجہ سے اس کی نسبت دوسروں کی طرف کی ہے:

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

چوتھا واقعہ:

کسی عالم کا اپنے ہم عصر دوسرے عالم کے علم وفضیلت کا اعتراف یا ان سے استفادہ کرنے کا اقرار کرنا اگرچہ بالکل معدوم تو نہیں البتہ شاذ ونادر ضرور ہے، لیکن دارالعلوم دیوبند کے سپوتوں نے بے شمار ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں ہم عصروں کی بلندیوں کا اعتراف اور ان کی فضیلت وعظمت کو تسلیم کرنا نمایاں طور پر نظر آتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی خدمت میں بیعت ہونے کی غرض سے حاضر ہوئے، حضرت شیخ الاسلامؒ نے ان کے اصرار کے باوجود حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی عظمت وفضیلت کا ذکر واعتراف کرتے ہوئے اُن سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا، صرف مشورہ ہی نہیں بلکہ ان کو لے کر تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت تھانویؒ سے ان دونوں کو بیعت کرلینے کی درخواست کی، حضرت حکیم الامتؒ نے بھی حضرت شیخ الاسلامؒ کے مقام کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے فرمایا کہ یہ لوگ چونکہ پہلے

آپ ہی کے پاس حاضر ہوئے ہیں، اس لیے آپ ہی ان کو بیعت کرلیں، چنانچہ حکیم الامتؒ کے اس فرمان کے احترام میں شیخ الاسلامؒ نے دونوں کو بیعت تو کرلیا، لیکن اصلاح کا معاملہ حضرت حکیم الامتؒ کے سپرد کردیا، حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب دامت برکاتہم کی تواضع سے متعلق جو چوتھا واقعہ میں نقل کرنا چاہتا ہوں وہ بھی اکابرین کی یاد کو تازہ کرنے والا واقعہ ہے:

تصنیف وتألیف کے میدان میں حضرت الاستاذ کا سب سے بڑا کام ''ایضاح البخاری'' شرح صحیح البخاری کی ترتیب ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کتاب کی ترتیب آپ ہی کی محنتوں کا ثمرہ ہے، لیکن آپ کی تواضع کا یہ عالم ہے کہ اپنے ہم عصر اساتذۂ دارالعلوم سے مشکل مقامات پر تبادلۂ خیال کرنے اور اس کو استفادہ قرار دینے اور پھر تحریری شکل میں اس کے اعتراف کرنے سے اُن کو کوئی تردد لاحق نہیں ہوتا، چنانچہ ایضاح البخاری جلد چہارم، صفحہ نمبر: ۵ پر ''عرض مرتب'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: ''اصلاحِ نظر کے تدارک کی یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ مشکل مقامات پر دارالعلوم کے بالغ نظر اساتذۂ کرام سے رجوع کا اہتمام کیا جاتا ہے، خصوصاً حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم سے عام طور پر تبادلۂ خیال، مذاکرہ اور استفادے کا موقع میسر ہے اور حضرتِ موصوف بھی از راہِ کرم بڑی دلچسپی کے ساتھ وقت مرحمت فرماتے ہیں اور کبھی کبھی حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم سے بھی تبادلۂ خیال یا مشورہ کیا جاتا ہے۔ اللہ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔''

اسی طرح جب حضرت الاستاذ نے ایضاح البخاری جلد ششم کی ترتیب میں اپنے ایک ہونہار نوجوان شاگرد جناب مولانا فہیم الدین صاحب (جو اَب دارالعلوم

دیوبند میں مدرس ہوگئے ہیں) سے اپنی سرپرستی میں تعاون لینا شروع فرمایا تو اس تعاون کے اعتراف میں ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے مرتب کی حیثیت سے اپنے نام کے ساتھ ان کا نام بھی بڑھادیا، جسے خود مولانا فہیم الدین صاحب خوردنوازی اور کرم گستری قرار دیتے ہوئے ایضاح البخاری جلد ششم، صفحہ نمبر: ۶ پر ''عرض مرتب دوم'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: ''مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے کہ کتاب کی پیشانی پر میرا نام مرتب کے طور پر آئے، لیکن حضرت والا کی خوردنوازی اور کرم گستری ہے کہ مرتب دوم کی حیثیت سے میرا نام آرہا ہے''۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب مدظلہم کے اس عمل سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو مصنف بننے کے شوق میں مختلف مصنفین کی عبارات لے لیتے ہیں اور ان کا نام یا حوالہ تک ذکر نہیں کرتے، یا دوسروں سے کام کرالیتے ہیں اور نام اپنا ظاہر کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ایسے حضرات کی تصانیف میں کوئی کشش یا نورانیت محسوس نہیں ہوتی۔

بہرصورت! اس مختصر سفر میں حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری وملاقات کی سعادت بھی نصیب ہوئی اور ان کے گراں قدر ملفوظات سے استفادہ کا موقع بھی میسر ہوا، ساتھ ساتھ انہوں نے احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہوئے ایک پُرتکلف دعوت اور کچھ ہدایا -جو میرے لیے تبرکات کی حیثیت رکھتے ہیں- سے بھی نوازا۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں صحت وعافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے۔[1]

---

[1] حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نے ستتر سال کی عمر میں ہفتے کی شب ۲۳ شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ مئی ۲۰۱۷ء رات چار بج کر دس منٹ پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین صاحب زید مجد ہم کی خدمت میں حاضری

اس سفر میں اللہ کے فضل وکرم سے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا علامہ قمر الدین احمد صاحب گورکھپوری دامت برکاتہم العالیہ استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی اور ان کی نصیحتوں اور قیمتی ملفوظات سے استفادہ کا موقع نصیب ہوا۔ آپ نے بہت ہی شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے ہوئے اپنے ملفوظات ومجالس کا مجموعہ ''جواہراتِ قمر'' عنایت فرمایا، اور چائے وپھل فروٹ سے بھی احقر کا اکرام فرمایا۔ احقر نے ان سے حدیث کی دو کتابیں (شرح معانی الآثار اور سنن نسائی) پڑھی ہیں۔

حضرت الاستاذ دارالعلوم کے قدیم ترین استاذوں میں سے ہیں، دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ۱۳۸۶ھ کو حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی (متوفیٰ ۱۳۸۷ھ) قدس سرہٗ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے توسط سے عمل میں آیا۔ اس وقت سے آج تک پوری نصف صدی گزر چکی ہے کہ آپ دارالعلوم میں پڑھا رہے ہیں۔ ابتدا سے لے کر دورۂ حدیث وتکمیلات تک ہر فن پڑھا چکے ہیں اور ہر فن پر عبور رکھتے ہیں۔ اپنے مخدوم واستاذ محترم امام المعقولات حضرت علامہ

بلیاوی قدس سرہٗ کی خدمت وصحبت کی برکت سے فن معقولات میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل ہے۔ آج کل دورۂ حدیث میں صحیح مسلم شریف پڑھا رہے ہیں۔

حضرت الاستاذ پڑھانے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تربیت واصلاح پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ اس مقصد کے تحت دورانِ تدریس علمی تحقیقات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ہدایات وتعلیماتِ نبویہ پر عمل کرنے کی ترغیب اور اس سلسلہ میں اکابرین کے واقعات بیان کرنا آپ کا معمول ہے۔ بعد العصر آپ کی رہائش گاہ کے قریب واقع مسجدِ طیّب میں سالوں سے آپ کی اصلاحی مجالس کا سلسلہ قائم ہے، جس سے طلبہ اور عام نمازیوں کو استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ بیعت وسلوک کے میدان میں آپ کو اپنے استاذ ومخدوم حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی قُدّس سرّہ اور حضرت مولانا شاہ ابرارالحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت وخلافت حاصل ہے۔

تقریباً ۷ رسال سے شہر آمبور (تمل ناڈو) کی ایک مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے ہیں۔ ان ایام میں اپنے مواعظ وگراں قدر مجالس سے ایک بڑے مجمع کو مستفیض فرماتے ہیں۔ آپ کے ایک شاگرد جناب مولانا سعادت اللہ خاں صاحب قاسمی نے ان مواعظ کو ترتیب دے کر ''جواہراتِ قمر'' کے نام سے جلد اول شائع کردی ہے۔ اللہ سے امید ہے کہ جواہرات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

حضرت الاستاذ کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، اختلافات کا حصہ نہیں بنتے، اگر خدانخواستہ اختلافات کا کوئی واقعہ رونما ہوجاتا ہے

تو بالکل الگ تھلگ ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔رواں ہجری صدی کے شروع میں دارالعلوم دیوبند میں جب اختلافات کا ایک طوفان اٹھا تو انہوں نے کافی حد تک یکسوئی اختیار کی اور جب اللہ تعالیٰ نے مجلس شوریٰ کی زیرسرپرستی دارالعلوم کو دوبارہ کھلوایا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے پھر سے پڑھانا شروع فرمایا جو آج تک جاری ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں صحت وعافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے۔

حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم واستاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند سے بھی اس سفر میں متعدد نیازمندانہ ملاقاتیں ہوئیں اور انہوں نے بھی احقر کو اکرام سے نوازا، جس زمانہ میں احقر دارالعلوم میں مقیم تھا، اس وقت دارالعلوم کی تدریس یا انتظام سے مفتی صاحب کی وابستگی نہیں تھی، البتہ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہٗ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند سے چونکہ ان کا اصلاحی تعلق تھا (اِس وقت حضرت فقیہ الامت کے اجل خلفاء میں ان کو شمار کیا جاتا ہے) اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً دیوبند حاضری دیتے رہتے تھے اور احقر کا بھی حضرت فقیہ الامت قدس سرہٗ سے اصلاحی تعلق قائم ہوگیا تھا اور ان کی مجلسوں میں حسبِ توفیق شریک ہوا کرتا تھا، اس دوران مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب سے بھی ملاقات ہوجایا کرتی تھی۔

پاکستان منتقلی کے بعد احقر کو پتہ چلا کہ مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی کو مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا رُکن منتخب کیا گیا ہے جس سے دل بہت خوش ہوا، اس لیے کہ موصوف میں اس اہم ذمہ داری کی اہلیت موجود تھی، اور جب ۱۴۳۲ھ کو حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا انتقال ہوا اور مادرِ علمی کا سب سے اہم اور نازک یہ عہدہ کچھ آزمائش وامتحان کے دور سے گزرنے لگا،

اور اندرونِ ملک و بیرونِ ملک پھیلے ہوئے بہی خواہانِ دارالعلوم کے قلوب اپنے رب کی طرف متوجہ ہوکر ان دعاؤں میں مصروف ہو گئے کہ اے اللہ! دارالعلوم کو ایک مخلص، مدبر، باصلاحیت اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والا خادم (مہتمم) مہیا فرما، تو بالآخر وہ دعائیں رنگ لائیں اور مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا مفتی ابولقاسم صاحب نعمانی کو مستقل مہتمم کی حیثیت سے منتخب کیا جس پر تمام بہی خواہان و خیر خواہانِ دارالعلوم نے اطمینان کا اظہار کیا۔

دار العلوم کے دیگر مشائخ کرام سے ملاقاتیں

اپنے اساتذۂ کرام اور حضرت مہتمم صاحب کے علاوہ حضرت مولانا عبد الحق صاحب اعظمی (۱)، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی، حضرت مولانا عبد الخالق صاحب مدراسی (نائب مہتمم دار العلوم دیو بند)، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی (مدیر ماہنامہ دار العلوم)، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری، حضرت مولانا محمد امین صاحب پالن پوری اور حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب بستوی دامت برکاتہم العالیہ (اساتذۂ حدیث دار العلوم دیو بند) سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

مذکورہ تمام حضرات اس زمانہ سے دار العلوم میں پڑھا رہے ہیں جس زمانہ میں راقم الحروف بھی دار العلوم کے خادموں میں سے ایک خادمِ تدریس کی حیثیت سے وہاں کام کر رہا تھا۔ ان تمام حضرات کی عظمت وفضیلت کا اس وقت بھی قائل تھا اور آج بھی ہوں، البتہ اُن سے پڑھنے کی سعادت میسر نہیں ہو سکی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس سفر میں ان تمام حضرات سے خوشگوار ماحول میں ملاقاتیں ہوئیں، اور ماضی کی دلچسپ یادوں کو تازہ کیا اور انہوں نے احقر کی ذرہ نوازی واکرام بھی فرمایا۔

---

۱) ہفتے کی شب یکم ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ھ حضرت مولانا عبد الحق صاحب اعظمی کا انتقال ہو گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب سے ملاقات

اپنی مادرِ علمی کے اس سفر کے دوران جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب زید مجدہم استاذ ادب عربی ومدیر مجلہ عربی ''الدّاعی'' دارالعلوم دیوبند سے ان کے گھر پر ملاقات کی سعادت حاصل کی، جہاں موصوف نے اپنے نفیس دسترخوان پر چائے ودیگر لوازمات سے احقر کا اکرام کیا، مولانا کا تقرر دارالعلوم میں ماہِ شوال ۱۴۰۲ھ کو بحیثیت استاذ ادب عربی ومدیر جریدہ عربی ''الدّاعی'' ان کے استاد ومربی حضرت مولانا وحید الزمان صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۴۱۵ھ) سابق استاذ ومعاون مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تحریک پر ہوا، احقر اس وقت تخصص فی الفقہ (شعبۂ افتاء) کا طالب علم تھا اور چند ہی مہینے بعد ماہِ صفر ۱۴۰۳ھ کو دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے احقر کا تقرر بھی عمل میں آیا، اس وقت سے جناب مولانا نور عالم صاحب کو جانتا ہوں۔

میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا نور عالم صاحب نے اپنے مربی حضرت مولانا وحید الزمان صاحب قدس سرہٗ کی تمنا کے مطابق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عربی ادب کے میدان میں خدمت انجام دی، ایک طرف سے انہوں نے

ایسے لائق وفائق شاگرد تیار کردیئے جنھوں نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد پورے ملک وبیرونِ ملک کے تعلیمی اداروں میں عربی ادب وعربی زبان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے خوب کام کیا، اور دوسری طرف سے مولانا نے عربی مجلہ ''الدّاعی'' کو بامِ عروج پر پہنچایا، ''الدّاعی'' کا اجراء دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا وحیدالزمان صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیرِ سرپرستی اور مولانا بدرالحسن صاحب قاسمی کی زیرِ ادارت ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء کو پندرہ روزہ عربی جریدے کی صورت میں شروع ہوا۔ ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء کو اس کی ادارت جناب مولانا نور عالم امینی صاحب کے سپرد ہوئی، مولانا نے اپنی محنت وخداداد صلاحیت کے ذریعہ اس کو ترقی دیتے ہوئے ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۳ء کو ظاہری وباطنی حسن سے آراستہ ماہوار مجلہ کی شکل میں نکالنا شروع کیا جو تا حال جاری ہے، اس مجلہ نے عالمِ اسلام اور بالخصوص عالمِ عرب میں یہ ثابت کردیا کہ دارالعلوم دیوبند کو صرف فقہ وحدیث وتفسیر ودیگر فنون ہی میں نہیں، عربی ادب میں بھی مرکزیت حاصل ہے، مجلہ ''الدّاعی'' اور اس کے مدیر مولانا نور عالم صاحب کی مقبولیتِ عامہ کی مناسبت سے دو واقعے نمونہ کے طور پر سپردِ قلم کرتا ہوں:

پہلا واقعہ

۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹۹۴ء ملاقاتی ویزا کے ذریعہ احقر کا ریاض سعودی عرب جانا ہوا، اسی سفر میں ''إدارة الدعوة فی الخارج'' (جو پہلے دارالافتاء کا اور اب وزارتِ مذہبی امور کا ایک ذیلی ادارہ ہے) کے ایک ذمہ دار سعودی عالم شیخ

عبدالرحمن المھیزع رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، وہ اہلِ زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب اور مطالعۂ کتب کا کافی ذوق وشوق رکھتے تھے اور ان کے پاس اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے آئے ہوئے عربی رسائل واخبارات کا ڈھیر لگا رہتا تھا، انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان تمام رسائل میں سرفہرست ''الداعی'' کو سمجھتا ہوں، اوراس کوسب سے اوپر رکھ کر شروع سے آخر تک پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کی جامعیت، صاف گوئی، تصاویر سے خالی ہونے، ظاہری وباطنی جمال اور بالخصوص شیخ نور (مولانا نور عالم صاحب) کے ''كلمة العدد'' اور 'اشراقة'' نے مجھے بے حد متأثر کیا ہے۔

دوسرا واقعہ

ماہِ محرم ۱۴۲۸ھ مطابق ماہِ فروری ۲۰۰۷ء کو سعودی عرب کے نائب وزیر مذہبی امور محترم شیخ عبدالعزیز العمار کی سرکردگی میں ایک وفد نے پاکستان کے دینی مدارس کا دورہ کیا تھا، جس کے اعزاز میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے ''ریجنٹ پلازہ'' (Regent Plaza) کراچی میں جلسہ منعقد کیا تھا جس میں پاکستان بھر سے بڑے بڑے علماء، مدارس کے ذمہ داران، وفاقی وزیر مذہبی امور پاکستان اور دیگر معززین شریک ہوئے تھے۔ اس عظیم الشان جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے شیخ عبدالعزیز العمار نے دارالعلوم دیوبند اور مسلک دیوبند کے دیگر مدارس کی دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس ضمن میں عربی مجلہ ''الداعی'' اور اس کے مدیر محترم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کا بلند القاب کے ساتھ ذکر کیا

جس سے مسلک دیو بند سے تعلق رکھنے والے علماء (بالخصوص اس حقیر طالب علم) نے بڑی مسرت وخوشی محسوس کی۔ اللہ تعالیٰ مولانا نور عالم صاحب کو صحت وتندرستی کے ساتھ تادیر عربی زبان اور دارالعلوم دیو بند کی خدمت کا موقع عنایت فرمائے۔

اپنے ہم عصر اور دوست اساتذہ سے ملاقاتیں

اپنی زندگی کے اس ناقابل فراموش سفر میں جہاں اپنے اساتذۂ کرام اور دیگر مشائخِ عظام کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، وہاں اپنے ان ہم عصر اور دوست اساتذہ کا دیدار اور ان سے شرفِ لقاء بھی نصیب ہوا جن کے ساتھ ماضی میں بے تکلف ملاقاتیں، دعوتوں کا تبادلہ، بعد العصر اکثر ایک ہی ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلنے اور دارالاقامہ کا نظام ایک ہی ساتھ سنبھالنے کا سلسلہ رہا تھا۔ ان حضرات میں سے جناب مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی (جو اَب نائب مہتمم ثانی دارالعلوم دیو بند بھی بنائے گئے ہیں) اور جناب مولانا محمد نسیم صاحب بارہ بنکوی سرفہرست ہیں۔

ان دونوں حضرات اور احقر کا ایک ہی ساتھ دارالعلوم دیو بند میں تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ - ۱۴۰۳ھ کو تقرر ہوا تھا، حسنِ اتفاق سے تینوں کو بچوں سمیت ایک ہی عمارت ''دارالمدرسین'' میں رہائش بھی ملی تھی، اس سفر میں پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر دارالمدرسین ہی میں مولانا محمد نسیم صاحب کے دسترخوان پر تینوں نے ایک ہی ساتھ ناشتہ کیا، ناشتہ کے بعد ان کے قریب میں رہائش پذیر بزرگ استاذ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی سے ملاقات

ہوئی جنہوں نے بہت اکرام کیا، موصوف شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ کے شاگردوں میں سے ہیں (دارالعلوم میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کے شاگرد چند ہی رہ گئے ہیں) اور طلبہ میں ایک مقبول و مشفق استاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، عمر میں ہم تینوں سے کافی بڑے ہیں، لیکن اپنی تواضع کی بنیاد پر ہمارے ساتھ ان کا معاملہ بے تکلف دوستوں جیسا ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے۔(۱)

چند نوجوان اساتذہ سے ملاقاتیں

اس باسعادت سفرِ دارالعلوم دیوبند میں چند اُن نوجوان اساتذۂ کرام سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جن کی تقرریاں دارالعلوم سے میری واپسی کے بعد ہوئی ہیں۔ ان حضرات کا علمی انہماک، تدریسی ذمہ داری کو نباہنے کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان سے بھی اچھی دلچسپی اور اپنے بڑوں اور اساتذہ سے مضبوط تعلق اور ان کے مشوروں سے چلنا، ان تمام امور کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ الحمدللہ! مادرِ علمی کا علمی و عملی دونوں میدانوں میں امتیاز جیسا کہ ہمیشہ برقرار رہا ہے، ایسا ہی آئندہ بھی ان جیسے نوجوانوں کے ذریعہ ان شاء اللہ! برقرار رہے گا۔

ان نوجوان اساتذہ میں جناب مولانا عبداللہ صاحب معروفی، جناب مولانا عارف جمیل صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد علی

---

۱) بروز بدھ ۲۴ ذوالقعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۹ ستمبر ۲۰۱۵ء حضرت مولانا عبدالرحیم بستوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ رحمہ اللہ رحمةً واسعةً

صاحب بجنوری، جناب مولانا توحید عالم صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد عثمان صاحب ہوڑوی، جناب مولانا اشرف عباس صاحب قاسمی وغیرہ (زیدمجدہم) شامل ہیں۔

نوجوان اساتذۂ کرام میں سے کچھ حضرات نے اپنی تالیفات کا ہدیہ بھی پیش کیا، فجزاهم الله خیرًا، ان تالیفات کو دیکھ کر ان کی صلاحیتوں اور محنتوں کا اندازہ ہوا، بالخصوص مولانا عبداللہ صاحب معروفی استاد شعبۂ تخصص فی الحدیث کی تالیف ''حدیث اور فہم حدیث'' سے دل کافی خوش ہوا، یہ کتاب ۴۰۵ر صفحات پر مشتمل ہے، جس میں علم حدیث کی تعریف وتقسیم، حجیتِ حدیث وفتنۂ انکارِ حدیث، تاریخِ تدوین حدیث وہندوستان میں علم حدیث، درسی کتبِ حدیث کا مختصر تعارف اور قواعدِ تخریج وغیرہ اہم موضوعات سے متعلق اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

اسی طرح مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی استاد دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالقدوس صاحب قاسمی استاد دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ دونوں کی محنت سے تیارشدہ کتاب ''القراءة العربية'' بھی کافی پسند آئی۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے جس میں ماہرین تعلیم عرب اُدباء کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے، لیکن غیر عرب طلبہ کی استعداد کو بھی سامنے رکھا گیا ہے اور ایسے ''نصوص وتمارین'' کا انتخاب کیا گیا ہے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جاذبیت بھی رکھتے ہیں اور عربی زبان کے ساتھ ساتھ اسلامی آداب بھی سکھاتے ہیں۔

نوجوان اساتذہ میں سے مولانا عارف جمیل صاحب قاسمی مدرس دارالعلوم دیوبند (جن کا تدریس کے ساتھ ساتھ حال ہی میں اپنے استاد ومربی جناب مولانا

نور عالم خلیل امینی صاحب مدیر عربی مجلہ ''الداعی'' کے معاون کی حیثیت سے انتخاب بھی عمل میں آیا ہے) کے عربی مضامین جو''الداعی'' میں چھپتے رہتے ہیں، بالخصوص ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' (اردو) کی قسط وار تعریب کو دیکھ کر دل سے اُن کے لیے دعا نکلی، اللہ تعالیٰ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

جامع مسجد رشید میں نمازِ جمعہ کی امامت

دارالعلوم دیوبند میں اس مختصر قیام کے دوران دفتر اہتمام کی طرف سے جامع مسجد رشید کے امام صاحب کے ذریعہ یہ پیغام موصول ہوا کہ احقر بروز جمعہ ۹/۷/۱۴۳۵ھ مطابق ۹/۵/۲۰۱۴ء کو جامع مسجد رشید میں نمازِ جمعہ پڑھا کر پرانی یادوں کو تازہ کرادے، اس حکم کو اپنے لیے سعادت سمجھ کر اس امید پر قبول کیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس دنیا میں میری خامیوں اور نااہلیت پر پردہ ڈال کر علماء وصلحاء کی ایک عظیم جماعت کی امامت وخطابت کا موقع دے رہا ہے، شاید قیامت میں بھی ان ہی صلحاء کے طفیل میں اس گنہگار کا بیڑا پار کرادے۔

جامع مسجد رشید میں اہل علم کے اس بارعب وبابرکت اجتماع اور عنقریب آنے والے سالانہ امتحان کی مناسبت سے احقر نے اپنے خطبہ میں علم اور اہل علم کی فضیلت سے متعلق قرآن پاک کی چند آیتیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند حدیثیں تشریح کے ساتھ پیش کیں، اور امتحانات کی مناسبت سے صحیح البخاری میں ''کتاب العلم'' کے اندر امتحان کی اہمیت سے متعلق قائم شدہ عنوان ''بابُ طرح الإمام المسألةَ علی أصحابہِ لیختبر ماعندھم من العلم'' کا ذکر کیا، اور پھر مذکورہ باب کے تحت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے جو حضرت عبداللہ بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے صحابہؓ کے سامنے ایک سوال پیش کرنے اور ان سے جواب طلب کرنے کا تذکرہ ہے وہ بھی پڑھی، اور ساتھ ساتھ ان دنیوی امتحانات کی مناسبت سے قبر میں تین سوالات پر مشتمل نکیر و منکر کے امتحان اور اس کی تیاری کی ضرورت اور پھر قیامت کے دن جو تفصیلی امتحان ہوگا اس کا بھی تذکرہ اور اس کی تیاری کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

نماز پڑھانے کے بعد دعا کے دوران دارالعلوم دیوبند اور اس کے اساتذۂ کرام وطلبۂ عزیز کی عظمت، دارالعلوم کے در و دیوار سے احقر کی دیرینہ وابستگی، اس کے احاطہ میں ایک اچھا خاصا وقت گزارنے اور پھر جسمانی طور پر اس سے ایک طویل جدائی اور جدائی کے بعد ایک مرتبہ پھر اس کی چاردیواری میں نیازمندانہ حاضری کا تصور کرتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہوگئی جس کو دبانے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ سنتوں سے فارغ ہونے کے بعد دارالعلوم کے چند اساتذۂ کرام، طلبۂ عزیز کی ایک بڑی تعداد اور شہرِ دیوبند کے رہنے والے کچھ پرانے جاننے والے اور کچھ نئے حضرات سے شرفِ مصافحہ کا موقع نصیب ہوا، اس دوران یہ بھی پتہ چلا کہ دارالعلوم کے جوان اساتذہ میں سے تقریباً سات آٹھ اساتذہ ایسے ہیں جنہوں نے احقر سے دارالعلوم میں مدرسی کے زمانہ میں کچھ نہ کچھ پڑھا ہے، یہ جان کر اللہ کا شکر ادا کیا اور بڑی خوشی ہوئی کہ دارالعلوم کے در و دیوار کے اندر احقر کی خدمت کا سلسلہ اب بھی بحمداللہ ایک حد تک بالواسطہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رکھے۔

شہر دیوبند کے چند دیگر دینی اداروں کی زیارت

اس دلچسپ سفر میں دارالعلوم کے علاوہ شہر دیوبند کے چند دیگر ایسے دینی اداروں کی زیارت کا موقع بھی ملا جواحقر کی مدرسی کے زمانے میں موجود نہیں تھے، ان اداروں میں سے ایک ''دارالعلوم (وقف)'' ہے جس کے مہتمم حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہم ہیں۔اس ادارہ نے مختصر مدت میں بڑی ترقی کی ہے، جب میں دیوبند میں تھا اس وقت ''دارالعلوم (وقف)'' قائم تو ہوگیا تھا، البتہ عمارت نہ ہونے کی وجہ سے اس نے شہر دیوبند کی جامع مسجد میں کام شروع کردیا تھااور عیدگاہ کے قریب اس کے لیے مستقل عمارت کے ارادہ سے زمین حاصل کرلی گئی تھی، اس سفر میں راقم نے دیکھا کہ اس زمین پر ایک شاندار عمارت کھڑی ہے جس میں درسگاہیں، دارالاقامہ، دفاتر اور مدرسہ کی تمام ضروریات کا انتظام موجود اور تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، اور سب سے اچھی اور باعث اطمینان چیز یہ نظر آئی کہ اب الحمدللہ! اختلاف کی کیفیت بھی ختم ہوچکی ہے اور دونوں ادارے (دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف) اپنے اپنے دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور ذمہ داران کا آپس میں اچھا تعلق بھی قائم ہے۔

مولانا عبدالرشید صاحب بستوی فاضل دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر دیوبند کے ایک اور دینی ادارے ''جامعة الإمام محمد أنور الكشميري'' کی زیارت کا موقع بھی ملا، اور مولانا موصوف- جو مذکورہ ادارہ کے ایک قابل استاد اور صدرالمدرسین اور احقر کے مخلص دوست ہیں- کی خواہش پر طلبہ کی تقریری

انجمن کے اختتامی پروگرام میں شریک ہوکر طلبہ کی خدمت میں چند باتیں بھی عرض کیں، مولانا نے احقر کا بہت اکرام کیا اور رات کے کھانے پر مدعو بھی کیا۔

اسی طرح ''الجامعة الإسلامية للبنات''۔جس کے بانی و مدیر جناب مولانا سید اسجد صاحب مدنی زید مجدہم ہیں-کی زیارت کے لیے بھی حاضر ہوا اور اس کی نفاست و نظافت اور حسنِ انتظام کو دیکھ کر دل خوش ہوا، مولانا خود چونکہ سفر میں تھے، اس لیے ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کرسکا جس کا قلق اب تک باقی ہے، البتہ ان کے ہونہار صاحبزادے جناب مولانا حسن صاحب مدنی سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک پُرتکلف دعوت سے بھی نوازا۔ میرے ایک اور مخلص دوست مولانا مزمل حسین صاحب آسامی کا قائم کردہ مدرسہ ''جامعة الشيخ حسين أحمد المدنی'' کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور مولانا موصوف نے بھی احقر کا اکرام کیا اور ایک پرتکلف دعوت پر مدعو بھی کیا۔

قریب میں واقع ''شیخ الاسلام اکیڈمی'' جس کی نگرانی محترم مولانا سید امجد صاحب مدنی فرمارہے ہیں کہ زیارت اور وہاں کے علمی واشاعتی کاموں سے آگاہی وخوشی حاصل ہوئی، بالخصوص ''تحفة الأحوذی شرح جامع الترمذی'' پر مولانا سید امجد مدنی صاحب بارك الله فی علومهٖ وجهودهٖ کے تحقیقی کام (جس کا سلسلہ جاری ہے) سے دل بڑا خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

دارالعلوم دیو بند کی ترقی کے چند اہم اسباب

اس سفر کے دوران اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیو بند کے ماضی و حال پر غور کرتا ہوا اور اس کی بے مثال ترقی کا تصور کرتا ہوا ذہن اس طرف متوجہ ہوا کہ اس حیرت انگیز کامیابی کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ آخر میں چند اہم اسباب کی طرف ذہن منتقل ہوا جن کو اختصار کے ساتھ قلمبند کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

۱:- اخلاص وللّٰہیت

اللہ تعالیٰ نے اکابرین دارالعلوم کو اخلاص وللّٰہیت کا بھرپور حصہ عطا فرمایا تھا، بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا پیش کردہ آٹھ دفعات پر مشتمل دستور العمل جو ''اصول ہشتگانہ'' کے نام سے مشہور ہے، ایک بے نظیر دستور ہے۔ اُن آٹھ اصولوں بالخصوص اصل نمبر چھ اور اصل نمبر آٹھ پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانی کو اللہ تعالیٰ نے اخلاص وتوکل علی اللہ کا حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، ملاحظہ ہو اصل نمبر چھ:

> ''اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ! بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ

غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے''۔

اور اصل نمبر آٹھ بھی حرف بحرف نقل کی جاتی ہے:

''تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امیدِ ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیتِ اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے''۔

اخلاص کا یہ سلسلہ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں ہر زمانہ کے اندر جاری رہا ہے اور مستقبل میں بھی ان شاء اللہ! جاری رہے گا۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفّٰی ۱۴۳۲ھ) رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے دورِ اہتمام میں مدرسہ سے کسی قسم کی رعایت وسہولت قبول نہ کرنا اور نہ ہی اپنے فائق فرزند یا خاندان کے دوسرے فرد کو مدرسہ میں لگانا اس سلسلۂ اخلاص کی بقاء کی واضح دلیل ہے۔

۲:- محنت وسادگی

علم کی ترقی کے لیے مستقل محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور چونکہ محنت وسادگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لیے محنت وہی شخص کرسکتا ہے جس کی زندگی میں سادگی ہو، جو لوگ سہولت پسندی اور پرتعیش زندگی کے عادی ہوتے ہیں ان سے علمی میدان میں محنت نہیں ہوسکتی، انہیں تو ہمیشہ عمدہ سے عمدہ لباس، پرتکلف دعوتوں اور مہنگے ہوٹلوں کے کھانوں، غیر ضروری اسفار، عمدہ اور جدید ترین سواریوں اور نئی نئی سہولتوں پر مشتمل رہائش گاہوں کی فکر دامن گیر رہتی ہے، علمی کاموں کے لیے نہ

ان کے پاس فرصت ہوتی ہے اور نہ ہی محنت ومشقت برداشت کرنے کا حوصلہ۔

اکابر وفرزندانِ دارالعلوم دیوبند کی گھٹّی میں محنت وسادگی دونوں شامل ہیں۔ بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ سے لے کر آج تک علمائے دارالعلوم کی زندگیاں محنت وسادگی سے بھرپور، تکلفات سے دور اور خواہشات کی پیروی سے خالی نظر آتی ہیں، ان کی دنیوی تمنائیں قلیل اور اخروی مقاصد جلیل ہوا کرتے ہیں، اس لیے انہوں نے تدریس وتعلیم، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ، بدعات وفتن کی سرکوبی اور ہر دینی میدان میں ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ ان کی بلندیوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، ان ہی کارناموں اور کامرانیوں نے دارالعلوم کی معنویت کو بلند وبالا کر دیا ہے:

اس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

اس سفر کے دوران مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ محنت وسادگی کا وہ ماحول جو ۲۳ رسال قبل میں نے دیکھا تھا، وہ اب بھی تقریباً اسی طرح برقرار ہے۔ علیٰ سبیل المثال میں نے مشاہدہ کیا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند زید مجدہم کا ایک سادہ سا مکان ہے۔ بیٹھک میں معمولی پلاسٹک کا فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف حضرت الاستاذ کی زمینی نشست گاہ اور اس کے سامنے لکڑی کی معمولی سی لیکن چوڑی تپائی رکھی ہوئی ہے جس کے اوپر قلم وکاغذ اور زیرِ مطالعہ اہم کتابیں سلیقے اور ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں، اور میرے خیال میں وہ تپائی رنگ وپالش کے تکلف سے بھی آزاد تھی، یہی وہ تپائی ہے جس پر حضرت شیخ الحدیث مدظلہم مطالعہ بھی فرماتے ہیں اور تصنیف و

تالیف کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، اور اسی تپائی پر ہزاروں صفحات پر مشتمل کئی شروحات ودیگر کتابیں تالیف فرما چکے ہیں۔ اپنی نشست کے ساتھ ہی پیچھے اور دائیں طرف زیر مطالعہ کتابوں کی چند سادی سی الماریاں ہیں، اور ساتھ ساتھ اس کا مشاہدہ بھی ہوا کہ لباس، کھانے پینے، نشست و برخاست بلکہ تمام عادتوں میں سادگی ہے اور ایک دقیق نظام الاوقات کے تحت درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے۔

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم کے ساتھ ان کی بیٹھک میں بار بار ناشتہ اور کھانا کھانے کی نوبت پیش آئی، میں نے دیکھا کہ بیٹھک کا رنگ وروغن کافی پرانا ہو چکا ہے اور جگہ جگہ سے ختم ہو کر پلاسٹر بھی نظر آنے لگا ہے۔ کھانے کے لیے چمڑے کا گول اور سادہ سا دسترخوان زیر استعمال ہے۔ بیٹھک سے باہر برآمدے میں زائرین اور حضرت والا کے بیٹھنے کے لیے معمولی لکڑی کی بنی ہوئی چند بینچیں رکھی ہوئی ہیں۔ البتہ یہ بھی محسوس ہوا کہ بیٹھک اور برآمدے دونوں میں اس سادگی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سکون اور بلا کی کشش موجود ہے جو ہر زائر کو زبانِ حال سے سادگی اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

ایسی ہی سادگی ومحنت کا مشاہدہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری استاذِ حدیث، حضرت الاستاذ مولانا قمرالدین صاحب استاذ حدیث، حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی استاذ حدیث، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی استاذ حدیث اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم کے یہاں بھی ہوا۔ ان تمام جبال

العلم کی محنت وسادگی کو دیکھ کر ہر ذی شعور شخص کو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ مادّیت کے اس دور میں دنیوی لذّات کو اس طرح پس پشت ڈالنا اس بات کی علامت ہے کہ ان حضرات نے دنیوی زندگی کی حقیقت کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے کہ وہ صرف ''متاع الغرور'' (دھوکے کا سودا) ہے، اور آخرت کے بارہ میں بھی یہ حضرات اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ''وَإِنَّ الدَّارَ الْأٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ'' (اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے) مستقل طور پر سامنے رکھے رہتے ہیں۔

۳:- بااختیار شورائی نظام

دارالعلوم دیوبند کا نظم ونسق شروع ہی سے ''وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کے اصول پر قائم ہے، اہل علم وتقویٰ پر مشتمل ایک بااختیار مجلس شوریٰ عزل ونصب اور دیگر تمام اہم امور کی نگرانی کرتی ہے اور اس کو مکمل اختیار وبالادستی حاصل ہے، ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کی تصریح کے مطابق ابتدائی مجلس شوریٰ سات ارکان پر مشتمل تھی جن میں سرفہرست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نامِ نامی ہیں، بلکہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم نے اپنی مایۂ ناز کتاب ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' میں یہ ثابت کردیا ہے کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل قیامِ دارالعلوم سے بھی پہلے ہوچکی تھی۔

اس بااختیار مجلس شوریٰ کی برکت سے دارالعلوم اقرباء پروری، نامناسب یا غیرضروری تقرریوں اور دیگر فتن سے محفوظ ہے، اور دن بہ دن ترقی کی طرف گامزن ہے۔ جن اداروں میں شورائیت نہیں یا برائے نام ہے وہ ادارے ترقی

کے بجائے تنزل کی طرف سفر کرتے ہیں اور ان کی کارکردگی کمزور ہو کر آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔

۴:- وقفے وقفے سے نتیجہ خیز اختلافات کا رونما ہونا

مسلمانوں کے درمیان ذاتی و دنیوی مقاصد کے تحت اختلافات کو قرآن وسنت نے واضح طور پر منع فرمادیا ہے اور ایسے اختلافات کو مسلمانوں کی ناکامی کا سبب قرار دیا ہے، البتہ اصلاح کی غرض سے نیک نیتی کے ساتھ اگر کوئی آواز اٹھتی ہے اور اس سے بظاہر مسلمانوں کے درمیان ایک اختلاف کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، یا فرعی مسائل کے اندر حق کی تلاش میں اربابِ اجتہاد کے درمیان کوئی اختلاف رونما ہو جاتا ہے تو ایسا اختلاف اپنے نتیجہ کے اعتبار سے باعثِ رحمت اور موجبِ ثواب بن جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے علمی سمندر میں وقفے وقفے سے نیک نیتی پر مبنی اختلافات کا ایک طوفان اٹھنے لگتا ہے اور اس کی موجیں آپس میں ٹکراتی ہیں، اس طوفان سے بظاہر کچھ نقصانات بھی واقع ہو جاتے ہیں، مگر انجام کار یہ نظر آنے لگتا ہے کہ ان جزوی نقصانات میں کوئی نفعِ کلی مضمر تھا، اور اس تلاطم کے نتیجہ میں دارالعلوم کی اصلاح و ترقی، اس کی آواز کی وسعت و پھیلاؤ اور اس کے سرچشمۂ فیض و برکت سے زیادہ سے زیادہ تشنگانِ علوم نبوت کو سیراب کرنا مقدر تھا۔

چنانچہ قیامِ دارالعلوم (۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ) کے تقریباً اکسٹھ سال بعد ۱۳۴۴ھ کو اسی قسم کے اختلافات کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس نے ایک طوفان کی شکل اختیار کی

اور ۱۳۴۷ھ تک باقی رہا۔ اس کے نتیجہ میں علمائے دیوبند کی ایک جماعت نے حضرت مولانا علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۵۲ھ) کی سربراہی میں دارالعلوم کے درودیوار سے کوچ کرتے ہوئے اس کے پیغام کو لے کر گجرات کے دورافتادہ علاقہ کو۔ جو بدعت کدہ بنا ہوا تھا۔ علومِ نبوت سے سیراب کردیا، اوران کے ذریعہ ڈابھیل میں ایک عظیم الشان دینی مرکز نمودار ہوا جس کے فیوض و برکات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ دوسری طرف اس اختلاف کے نتیجہ میں دارالعلوم کی مسندِ حدیث کے لیے اللہ تعالیٰ نے جانشینِ شیخ الہند، سابق مدرس مسجدنبوی شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کا انتخاب فرمایا جن کے دریائے علم ومعرفت سے اکتیس سال تک بے شمار تشنگانِ علومِ دینیہ ومتلاشیانِ معرفتِ حق سیراب ہوتے رہے۔

اسی طرح مذکورہ اختلاف کے تقریباً ترپن سال بعدرواں پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں ایک مرتبہ پھر دارالعلوم کے سمندرِعلم میں تلاطم پیدا ہوا جس سے پورے برصغیر کے دینی حلقوں میں ایک ہلچل و ہیجان کی کیفیت پیدا ہوگئی، اور زمین کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے متبعینِ مسلک اہل حق اور محبینِ دارالعلوم کو بڑی فکر لاحق ہوئی کہ اس اختلاف کے نتیجہ میں اکابرین کی اس امانت اوردینِ اسلام کے اس اہم مرکز کو کہیں کوئی بڑا نقصان لاحق نہ ہوجائے، لیکن اللہ کے فضل وکرم سے دنیا نے دیکھا کہ دارالعلوم محفوظ رہا، بلکہ ایک نئے ولولے کے ساتھ مجلسِ شوریٰ کی زیرِ قیادت اور ایک ولی صفت، مدبر ومخلص اور منیب الی اللہ شخصیت حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب قدّس اللہ سرہٗ العزیز کے زیر اہتمام مزید

ترقی کی طرف گامزن ہوا، اور ساتھ ساتھ علمائے حق کا ایک نیا ادارہ بھی دیوبند کی سرزمین پر دارالعلوم (وقف) کے نام سے عالمِ وجود میں آیا جس سے دینی مراکز کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

۵: - صلاحیت وصالحیت کی بنیاد پر تقرریاں وترقیاں

دارالعلوم دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے گوناگوں خصوصیات وخوبیوں سے نوازا ہے، ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ صرف صلاحیت وصالحیت کی بنیاد پر تقرریاں ہوتی ہیں اور اسی بنیاد پر ترقیاں ملتی ہیں۔ نسب، رشتہ داری اور علاقائیت کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس بات کی ایک واضح نشانی یہ ہے کہ اس وقت منصبِ اہتمام پر فائز حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب کا تعلق ضلع ''بنارس'' سے ہے، ان کے نائب جناب مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی کا تعلق ''مدراس'' (چینائی) سے ہے، شیخ الحدیث وصدر المدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کا تعلق ''گجرات'' سے ہے۔ انتظامی اور علمی اعلیٰ مناصب پر فائز ان تینوں حضرات میں سے کسی کا بھی دارالعلوم کے اکابرین جیسے حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مدنی، حضرت شیخ الادب، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ابراہیم بلیاوی قدس اللہ اسرارہم وغیرہ کے خاندانوں سے کوئی نسبی تعلق نہیں، جس سے تقرریوں اور ترقیوں سے متعلق دارالعلوم کے مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس سفر میں دار العلوم دیو بند کے نظام سے متعلق ایک قابل صد تحسین نیا معمول میرے علم میں آیا جس نے مجھے بے حد متأثر کر دیا، اور وہ یہ کہ سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفّٰی ۱۴۳۲ھ) نے اقربا پروری کے سد باب کے لیے اپنے دورِ اہتمام کے آخری سالوں میں یہ معمول بنایا تھا کہ دار العلوم کے کسی استاذ محترم کے کسی فرزند ارجمند کو- جب تک کہ ان کے والد دار العلوم میں تدریس سے وابستہ ہوں- دار العلوم کا مدرس نہیں بنایا جائے گا۔

اس معمول سے متعلق احقر نے اطمینان حاصل کرنے کے لیے حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی موجودہ مہتمم دار العلوم دیو بند سے ان کے دونوں نائبین کی موجودگی میں دفترِ اہتمام کے اندر جب دریافت کیا تو انہوں نے تصدیق کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معمول حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے زمانے سے جاری ہے اور چونکہ سب کو اس معمول کے بارے میں علم ہے اور اس کے مطابق تعامل برقرار ہے، اس لیے اس کو چیلنج بھی نہیں کیا جاتا، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ اس تعامل کو باضابطہ اور تحریری طور پر دستور کا حصہ نہیں بنایا گیا ہے۔

اس تعامل کا عملی مشاہدہ راقم نے اس طرح بھی کیا کہ موجودہ اساتذۂ دار العلوم دیو بند کے صاحبزادگان میں سے کسی کو دار العلوم دیو بند کی تدریس پر فائز نہیں دیکھا، حالانکہ ان میں سے کئی صاحبزادگان کو میں بھی ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ان میں صلاحیت و صالحیت دونوں موجود اور دار العلوم کے مایۂ ناز فضلاء میں سے ان کو شمار کیا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر جناب مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب استاد حدیث و مفتی جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد جو جناب مولانا

قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری استاد حدیث دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے اور شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ کے نواسے ہیں، میں ان سے اس وقت سے واقف ہوں جب وہ دارالعلوم کے طالب علم تھے، احقر کا اس وقت مدرس کی حیثیت سے تقرر ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ امتحان میں اکثر پوزیشن لیتے تھے اور اساتذۂ کرام ان کی صلاحیت وصالحیت کے قائل تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد سے لے کر آج تک ایک لائق وفائق مفتی، کامیاب مدرس اور بہترین مصنف کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور صلاحیتوں میں خوب اضافہ بھی ہوا ہے اور دارالعلوم دیوبند میں ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے کام کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے والد محترم دارالعلوم کے مدرس ہیں، اس لیے ان کو وہاں پر تدریس کا موقع نہیں دیا جا سکتا، چنانچہ وہ ابتداء سے آج تک جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں مفتی و مدرس کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

اسی طرح جناب مولانا حسین احمد پالن پوری صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند جو کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کے صاحبزادے ہیں، ایک کامیاب مدرس واستاد حدیث، باعمل وباصلاحیت عالم دین اور ''تحفة الألمعي شرح سنن الترمذي'' اور ''تحفة القاري شرح صحيح البخاري'' کے مرتب ہیں، لیکن چونکہ ان کے والد ماجد دارالعلوم کے مدرس ہیں، اس لیے نہ ان کو اور نہ ہی حضرت الاستاذ کے دوسرے صاحبزادوں میں سے کسی کو دارالعلوم میں تدریس کا موقع دیا گیا۔

ان کے علاوہ جناب مولانا سید امجد مدنی صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کے صاحبزادے اور شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ کے پوتے ہیں، موصوف بھی ایک متقی اور باکمال مدرس اور ایک سنجیدہ وعلمی ذوق رکھنے والے عالم ہیں۔ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''نخب الأفکارفی تنقیح مبانی الأخبار'' کی تحقیق میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم کے معاون بھی رہے ہیں، لیکن ان کو بھی اس لیے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا موقع نہیں مل سکا کہ ان کے والد ماجد دارالعلوم کے مدرس ہیں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے اس معمول کے مطابق خود عمل کیا، چنانچہ اپنے صاحبزادے جناب مولانا انوار الرحمن صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند (جن کی شرافت، تقویٰ، سنجیدگی، معاملہ فہمی اور خوش اخلاقی سے ان کا ہر جاننے والا واقف ہے) کو انھوں نے اپنے تیس سالہ دورِ اہتمام میں نہ نائب مہتمم بنایا اور نہ ہی دارالعلوم کے کسی بھی شعبہ سے وابستہ کرنے کی کوشش کی، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب قدس سرہ کا یہ معمول متعارف کرانا ان کی نجات ورفعِ درجات کا سبب بنے گا۔ دارالعلوم دیوبند کے اس تعامل سے اگر کسی کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس سے دارالعلوم کو بعض باصلاحیت اور اس کے مزاج وماحول سے واقف لوگوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا تو میں ان کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ صرف چند متعین اشخاص سے متعلق اور وہ بھی ایک محدود وقت کے لیے دارالعلوم کو اگر استفادہ کا موقع نہ بھی ملے تو یہ اتنا بڑا نقصان نہیں جتنا نقصان اقربا پروری کے راستے کھول دینے کی صورت میں محتمل ہے۔

بہرصورت! دارالعلوم کی بے نظیر ترقی میں احقر کی نظر میں (غور کرنے کے بعد) بنیادی کردار مذکورہ پانچ اسباب نے ادا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دارالعلوم اور اس کی دینی خدمات کا سلسلہ تاروزِ قیامت جاری وساری رکھیں، آمین۔

دیگر مدارس کے ذمہ داران کو بھی دارالعلوم دیوبند کی پیروی کرنی چاہیے

دارالعلوم دیوبند کو پوری دنیا میں اور بالخصوص برصغیر میں پھیلے ہوئے دینی مدارس کے ذمہ داران، اساتذۂ کرام اور طلبہ اپنی مادرِ علمی تصور کرتے ہیں اور اس سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہیں، لہٰذا ان کو چاہیے کہ دارالعلوم سے ان کی محبت صرف زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ اکابرینِ دارالعلوم کے نقش قدم پر چلنے اور ان کے طریقۂ کار اور قائم کردہ اصولوں کی پیروی کو اپنا شعار بنالیں، اخلاص وتقویٰ، محنت وسادگی، بااختیار شورائی نظام قائم کرنے اور صلاحیت وصالحیت کی بنیاد پر تقرریوں اور ترقیوں کا اہتمام فرمالیں۔ سہولت پسندی، نام ونمود، غیرضروری مصروفیات اور بالخصوص اقربا پروری سے اجتناب فرمالیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں دینی ادارے ترقی کے بجائے پیچھے کی طرف سفر کرنا شروع کرنے لگتے ہیں اور لوگوں کا اعتماد آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے، اور ذمہ داران کو یہ بات بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ مدارس کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کی امانت ہیں، جن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کردی ہے، اور قیامت کے دن اس امانت کے ہر ہر پہلو سے متعلق ذمہ داران حضرات کو جواب دینا ہوگا۔

گنگوہ و تھانہ بھون حاضری کی تمنا

دیوبند کے اس مختصر سفر کے دوران دل چاہ رہا تھا کہ ہمارے دوسرے علمی ودینی مراکز بالخصوص گنگوہ وتھانہ بھون حاضری کا موقع بھی مل جائے، ان علمی مراکز کی زیارت اگرچہ قیام دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں ہوچکی تھی، لیکن ان کی کشش وبرکات اور شاندار تاریخ ہر زائر کو بار بار زیارت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ گنگوہ جو دیوبند سے تقریباً ۴۵ رکیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے وہ عظیم بستی ہے جو شیخ اجل حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۴۴ھ = شیخ اجل) کے زمانہ سے اولیاء اللہ واہل علم کا مرکز رہی ہے، اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ (متوفی ۱۳۲۳ھ) نے بھی یہیں سے مسندِ تدریس وارشاد کے ذریعہ دنیا کے گوشے گوشے کو بالذات یا بالواسطہ علوم نبوت کے انوار سے منور کردیا۔ میرے استاد و مرشد فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۷ھ) صدر مفتی دارالعلوم دیوبند بھی اسی بستی سے تعلق رکھتے تھے۔

تھانہ بھون ایسی ممتاز ہستیوں کا مرکز رہا ہے جن کی نسبت سے اس قصبے کو عالمی مقبولیت اور دائمی شہرت نصیب ہوئی، ان ممتاز ہستیوں میں سرِ فہرست سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ، حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ، حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

خانقاہِ تھانہ بھون ابتداءً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات کا مرکز رہی، لیکن ۱۲۷۴ھ کے مشہور معرکۂ شاملی میں حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی شہادت اور ۱۲۷۶ھ کو سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کی مکہ مکرمہ ہجرت اور ۱۲۹۶ھ کو حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی رحلت کے بعد اس ''دکانِ معرفت'' کی رونق میں جب کمی نظر آنے لگی تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ (جو مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مدرس تھے) نے تدریس کا سلسلہ ترک کر کے اپنے شیخ عالی مقام حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی نصیحت اور اپنے استاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی تسلی و ہمت افزائی پر عمل کرتے ہوئے ۱۳۱۵ھ کو خانقاہِ تھانہ بھون سے اصلاح و تزکیہ کا سلسلہ شروع فرما کر اس کی رونقوں کو نہ صرف یہ کہ بحال کر دیا، بلکہ ان میں چار چاند لگا دیئے، اور اس وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ (۱۳۶۲ھ) تک جو تقریباً نصف صدی پر محیط ہے اس خانقاہ میں تشریف فرما ہو کر وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ شریعت و طریقت، تزکیہ و اصلاحِ اعمال کے انوار پھیلاتے رہے۔ راقم عرض کرتا ہے کہ: حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی کتابوں کے مطالعہ اور اپنے اساتذۂ کرام اور دیگر بزرگوں سے ان کے واقعات سننے سے مجھے بڑا فائدہ محسوس ہوا ہے، اس لیے ذاتی طور پر بھی میں ان کا بے حد معتقد و ممنون ہوں۔

بہر صورت! دلی تمنا تو یہی تھی کہ گنگوہ و تھانہ بھون دونوں مقامات کی حاضری ہو جائے، لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ میرے پاس ''سہارنپور'' کا ویزا تو تھا جس کی

بنیاد پر میں گنگوہ جاسکتا تھا، لیکن تھانہ بھون چونکہ ''مظفرنگر'' میں آتا ہے اور ''مظفرنگر'' کا ویزا نہیں تھا، اس لیے تھانہ بھون نہیں جاسکتا تھا، لہٰذا بادل ناخواستہ تھانہ بھون کا ارادہ ترک کرکے بتاریخ ۱۱/ ۷/ ۱۴۳۵ھ بروز اتوار جناب مولانا سید امجد مدنی صاحب اور دارالعلوم کے ایک طالب علم اور ایک ڈرائیور بھائی محمد یاسین صاحب کی معیت میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ کی گاڑی میں گنگوہ روانہ ہوا، دیوبند سے ۴۵ رکیلومیٹر کے فاصلے پر واقع گنگوہ کا راستہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا، سب سے پہلے حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کے قائم کردہ دینی ادارے ''مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن'' کی زیارت کی جہاں ان کے صاحبزادۂ محترم جناب مولانا سید ازہر مدنی صاحب ناظمِ مدرسہ نے استقبال کیا اور اکرام سے بھی نوازا۔

مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے مزار کے بالکل قریب واقع ہے۔ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کی دوررَس اور حکیمانہ نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قامعِ بدعت وناشرِ سنت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے مزار کے ساتھ مستقبل میں جاہل عوام کی طرف سے رفتہ رفتہ بدعت کا سلسلہ شروع ہوجائے، لہٰذا انہوں نے مزار کے ساتھ ہی دینی مدرسہ قائم کرکے ایک طرف سے اس تاریخی بستی میں احیائے سنت کا سلسلہ برقرار رکھنے اور مزید پھیلانے کا انتظام فرمایا اور دوسری طرف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے مزار کو محتملہ بدعات وخرافات سے بچانے کا مضبوط ذریعہ قائم کردیا۔ جناب مولانا سید ازہر مدنی صاحب - جن کو

طالب علمی کے زمانہ سے میں جانتا ہوں- نہایت اخلاص وحکمت کے ساتھ یہاں کام کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دینی محنت کو قبول فرما کر مزید استقامت وحکمت سے مالامال فرمائے۔

مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن کی زیارت اور جناب مولانا سید ازہر مدنی صاحب کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پُرانوار پر حاضری دی جو بظاہر تو سادہ چبوترے پر واقع ایک کچی سی قبر ہے، لیکن زائر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں پرانوار وبرکات کی بارش برس رہی ہے، کیونکہ آپ نے پوری زندگی احیائے سنت، سرکوبیِ بدعت اور دین پھیلانے میں بسر کی، اور تقویٰ وطہارت، ایثار وللّٰہیت اور صبر وتحمل کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیریں خیر القرون کے بعد بمشکل مل سکتی ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد میرے شیخ ومرشد فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہٗ کے عزیزوں سے ملاقات اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی (جن کا چند روز قبل انتقال ہوا تھا) کی تعزیت کے لیے ان کی رہائش گاہ پر حاضری دی اور جناب بھائی محمد سہیل صاحب، جناب بھائی جاوید صاحب اور جناب بھائی شاہد صاحب سے ملاقات کر کے تعزیت کی اور اس موقع پر حضرت فقیہ الامت قدس سرہٗ کے اس مکان کی بھی زیارت کی جوانہوں نے اپنی زندگی ہی میں کسی کو ہبہ کر دیا تھا اور اپنی ملکیت میں کسی قسم کی جائیداد یا مکان یا کوئی بھی کاروبار وغیرہ باقی نہیں رکھا تھا، اور انتقال کے وقت اپنے استعمال کے کپڑوں اور سفر کے مختصر سامان کے علاوہ ان کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں تھا۔

حضرت فقیہ الامت قدس سرہٗ کے رشتہ داروں سے ملاقات کے بعد حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے، جو کہ بستی کے وسط میں واقع ہے۔ یہ وہ خانقاہ ہے جو حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ویران ہو چکی تھی اور بعد میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے اسے آباد کر دیا اور اس میں درسِ حدیث و اصلاح و تزکیہ کا کام شروع فرمایا اور اپنی وفات تک اسی میں جلوہ افروز رہے۔ خانقاہ کی زیارت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص کمرے اور اس میں رکھا ہوا اُن کی طرف منسوب سامان (چار پائی، تپائی، چھڑی، پان دان) کی زیارت کا موقع بھی نصیب ہوا، اور خانقاہ کے احاطے میں واقع حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل کی۔ البتہ شریعت سے ناواقف لوگوں کی طرف سے ان کی قبر کی پختگی اور اس پر موجود گنبد اور بعض دیگر بدعات کی موجودگی سے دل کو بڑا دکھ بھی ہوا اور وہاں پر زیادہ دیر لگانا مناسب نہیں معلوم ہوا اور جاتے وقت یہ تصور قائم رہا کہ کاش! حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اور اس کا ماحول بھی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور اس کے ماحول کی طرح سنت کے مطابق ہوتا اور ان کو روحانی اذیت پہنچانے کا یہ سلسلہ نہ ہوتا۔ اس موقع پر حضرت مولانا سید ارشد مدنی زید مجدہم کے قائم کردہ ''مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن'' کی ضرورت اور ان کے صاحبزادے جناب مولانا سید ازہر مدنی سلمہٗ اللہ جو حکمت کے ساتھ محنت کر رہے ہیں اس محنت کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوا۔ گنگوہ کی اس مختصر زیارت سے فارغ ہو کر سکون واطمینان کی کیفیت کے ساتھ ظہر سے پہلے دیوبند واپسی ہوئی۔

اکابرینِ دار العلوم کی طرف سے احقر کی ہمت افزائی اور احقر کو اپنی کم مائیگی کا احساس

مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کے اس مختصر قیام کے دوران اکابرین کی طرف سے احقر کی ایسی ہمت افزائی اور ذرہ نوازی کی گئی جس کا میں اپنے آپ کو ہرگز مستحق نہیں سمجھتا تھا، حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم العالی کی طرف سے دعوت نامہ اور اس کی بنیاد پر اسپیشل ویزا ملنا، ایئرپورٹ پر احقر کے استقبال کے لیے مولانا محمد سراج صاحب کو اپنی مخصوص گاڑی سمیت بھیجنا، جمعیت کے دفتر میں احقر کا اعزاز و مہمان نوازی، دہلی سے دیوبند جانے اور واپس آنے کا انتظام، دیوبند و دہلی میں قیام کے دوران مسلسل مہمان نوازی، پھر دار العلوم کے مہمان خانہ میں ایک وسیع و آرام دہ کمرہ میں قیام کا انتظام، اساتذۂ کرام کا احقر کو دعوتوں اور ہدایا سے نوازنا، مسجد چھتہ، مسجد قدیم اور مسجد رشید میں کبھی فجر اور کبھی مغرب کی نماز کے لیے احقر کو امام بنا دینا، اور جمعہ والے دن مسجد رشید میں جمعہ پڑھانے کے لیے احقر کو دفتر اہتمام کا پیغام موصول ہونا، اور حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند دامت برکاتہم کا تحریری طور پر خصوصی اجازت نامۂ حدیث مرحمت فرمانا (جو اس سفر کا ایک ناقابلِ فراموش اور سب سے اہم اعزاز ہے) ان تمام امور اور اپنی حقیقت کو سامنے رکھ کر مجھے سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۴۲۱ھ) کے غلام ”ایاز“ کا مندرجہ ذیل واقعہ یاد آیا اور اپنے آپ کو مخاطب کرکے دل میں بار بار کہا: ”ایاز! قدرِ خود را بشناس“ واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

''ایاز سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک غلام تھا جس پر سلطان کی خصوصی نظر عنایت وشفقت تھی، دوسرے اہل دربار ومقربین اس سے حسد کرنے لگے اور ان کے خلاف کسی موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ان حاسدین نے سلطان سے عرض کیا کہ حضور! آپ اس غلام پر بڑا اعتماد اور خصوصی عنایت فرماتے ہیں، جب کہ ہمیں اس کے بارہ میں شکوک وشبہات ہیں، اس لیے کہ ہم نے بار بار دیکھا ہے کہ وہ مجلسِ شاہی کو چھوڑ کر اپنے خلوت خانہ میں جاتا ہے اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر باہر چلا آتا ہے، کچھ پتا نہیں کہ وہ خلوت میں کیا کرتا ہے؟ حضور کو اس کی تحقیق کر لینی چاہیے۔ سلطان کو بھی فکر لاحق ہوئی کہ واقعی تحقیق تو کر لینی چاہیے کہ وہ اس تنہائی میں کیا کرتا ہے؟ چنانچہ ایک مرتبہ ایاز اس خلوت خانہ میں جانے لگا تو سلطان بھی اس کے پیچھے تھوڑی دیر کے بعد پہنچے، دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک پرانی سی گدڑی رکھی ہوئی ہے، ایاز اس کے سامنے کھڑے ہو کر یہ جملہ بار بار دُہرا رہا ہے: ''ایاز! قدرِ خود را بشناس'' جب وہ اپنے اس عمل سے فارغ ہوا تو سلطان نے اس سے پوچھا کہ تم یہاں کیا کرتے ہو؟ اور اس جملہ کا مطلب کیا ہے؟ ایاز نے عرض کیا کہ میرے محسن! میں جب شروع شروع میں آپ کے دربارِ عالی میں حاضر ہوا تھا اس وقت میری کوئی حیثیت نہیں تھی اور میرے جسم پر یہی گدڑی تھی، لیکن آپ کی خصوصی عنایات نے مجھے کہاں تک پہنچا دیا؟ یہ آپ خود جانتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اس گدڑی کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی حیثیت وحقیقت کو یاد کرتا رہوں اور اپنا ماضی پیشِ نظر رہے، تا کہ دماغ خراب نہ ہو جائے اور عُجب وخود فریبی میں مبتلا نہ ہو جاؤں''۔

احقر نے بھی اپنی مادرِ علمی کے اندر مذکورہ اعزاز کو دیکھ کر اپنا ماضی اور اپنی حیثیت وحقیقت اور بالخصوص ایک واقعہ کو یاد کیا، واقعہ یہ تھا کہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء کو پڑھنے کی غرض سے جب احقر نے پہلی بار دار العلوم دیوبند کی طرف سفر کا

آغاز کیا، اور ایک طویل و با مشقت سفر کے بعد بالآخر ایک پیسنجر ٹرین کے ذریعہ آدھی رات کو دیو بند ریلوے اسٹیشن پر بے سرو سامانی کی حالت میں اُترا اور وہاں سے سائیکل رکشہ کے ذریعہ صدر گیٹ دار العلوم دیو بند پہنچا تو دل بہت ہی خوش ہو رہا تھا کہ منزلِ مقصود آ گئی ہے اور ارادہ یہ تھا کہ اندر جا کر مسجدِ دار العلوم میں عشاء کی نماز (جو پیسنجر ٹرین میں زیادہ رش کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا تھا) ادا کروں اور اس بات پر کہ طویل و با مشقت سفر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا ہے شکرانہ کی دو رکعت نماز بھی ادا کروں اور پھر صبح اپنے داخلے کی کوشش کروں، لیکن میری حیثیت یہ تھی کہ مجھے اس کا اہل بھی نہ سمجھا گیا کہ گیٹ پر مقرر دربان مجھے اندر جانے کی اجازت دے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہاں سے آئے ہو؟ اور کس مقصد کے لیے اندر جانا چاہتے ہو؟ میں نے اردو زبان سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے ان کو یہ جواب دیا کہ ایک مسافر طالب علم ہوں، کافی دور سے دار العلوم میں پڑھنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، کہنے لگے کہ: پھر صبح آ جاؤ، میں نے عرض کیا کہ میں یہاں کی گلیوں سے ناواقف ہوں اور عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی ہے، براہِ کرم! مجھے مسجد جانے کی اجازت دیجیے، بڑی مشکل سے انہوں نے اندر جانے کی اجازت دی اور گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف واقع ''مسجد قدیم'' کا راستہ بھی بتا دیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد سفر کی تکان اتارنے اور تھوڑی دیر کے لیے آرام کی غرض سے لیٹنا چاہ رہا تھا، لیکن ناواقفیت کی وجہ سے کہاں جاتا اور کہاں آرام کرتا؟ مسجد کے سجدہ گاہ والے حصہ میں لیٹنا مناسب نہیں معلوم ہو رہا تھا، آخر میں مسجد کے اندر والے حصے اور صحن کے درمیان واقع سیڑھیوں کا انتخاب

کیا، اس لیے کہ یہ حصہ اگر چہ مسجد ہی کا حصہ تھا کم از کم سجدہ گاہ تو نہیں تھا، لہٰذا فجر کی اذان تک اپنی ایک پرانی سی صدری (گدڑی) سر کے نیچے رکھ کر انہی سیڑھیوں پر لیٹا رہا۔

بہر صورت! موجودہ سفر میں اپنی مادرِ علمی اور اساتذۂ کرام و اکابر کی طرف سے احقر کی ہمت افزائی وذرہ نوازی کو دیکھ کر اپنی گدڑی اور اپنے ماضی کو یاد کیا اور ایاز والے قصے کو اپنے اوپر منطبق پاکر ان ہی کا وظیفہ ''ایاز! قدرِ خود را بشناس'' دل دل میں دُہراتا ہوا اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اپنی حقیقت و ماضی کی گدڑی سے کبھی غافل نہ فرما اور خود فریبی سے محفوظ فرما۔

احقر کے پاس صرف پندرہ دن کا ویزا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پندرہ دن چند لمحات میں گزر گئے اور بروزِ منگل ۲۰/ ۷/ ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۰/ ۵/ ۲۰۱۴ء اس دعا کے ساتھ پاکستان واپسی ہوئی کہ اے اللہ! صحت و عافیت کے ساتھ بار بار مادرِ علمی اور وہاں کے بزرگوں کی زیارت کا موقع عنایت فرماتے رہیے۔ (آمین)

مرا امیدِ وصالِ تو زندہ میدارد
وگرنہ ہر دمم از ہجرِ تُست بیم ہلاک

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم وصلى الله تعالى على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

اس کتاب میں

اس سفرنامے میں حرمین شریفین اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کی والہانہ حاضری کی پُرکیف داستانِ محبت بھی ہے اور ازہرالہند "دارالعلوم دیوبند" کے نیازمندانہ سفر کی پُراثر حکایتِ وفا بھی۔ بلادِ عرب کے چند مایۂ ناز اہلِ علم وتقویٰ کے حیرت انگیز تذکرے و بصیرت افروز واقعات بھی قلمبند کئے گئے ہیں اور دارالعلوم دیوبند، گنگوہ اور تھانہ بھون کی چند پرانی اور چند موجودہ عظیم شخصیات سے متعلق تأثراتی مضامین، ان کی گراں قدر نصیحتیں اور مفید معلومات بھی۔

عقیدت ومحبت کے جن جذبات کے تحت ایک سادہ انداز میں یہ "حکایتِ مہر ووفا" جو لکھی گئی ہے ان جذبات کی بنیاد پر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ قاری کیلئے دلچسپ اور باعثِ اطمینان و سکون ثابت ہوگی، وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

عبدالرحیم غزنوی عفا اللہ عنہ

۲۹/۱۰/۱۴۳۸ھ

۳۰/۷/۲۰۱۷ء

مکتبہ غزنوی، سلام کتب مارکیٹ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
0317-7034000 – 0333-2114000